

”مجھے ایسا نہیں لگتا۔۔۔“ اس کا الجھہ سپاٹ ساڑ
نیلے سمندروں پر حیرت بارش کی طرح بر سر رہی تھی
اس شر کے لوگ محبت کرنا بھول گئے ہیں۔۔۔ یہ کہتے
ہوئے اس پر کی نیلے سمندروں جیسی گہری آنکھوں میں میں خلوص نہیں رہا تیمور۔۔۔

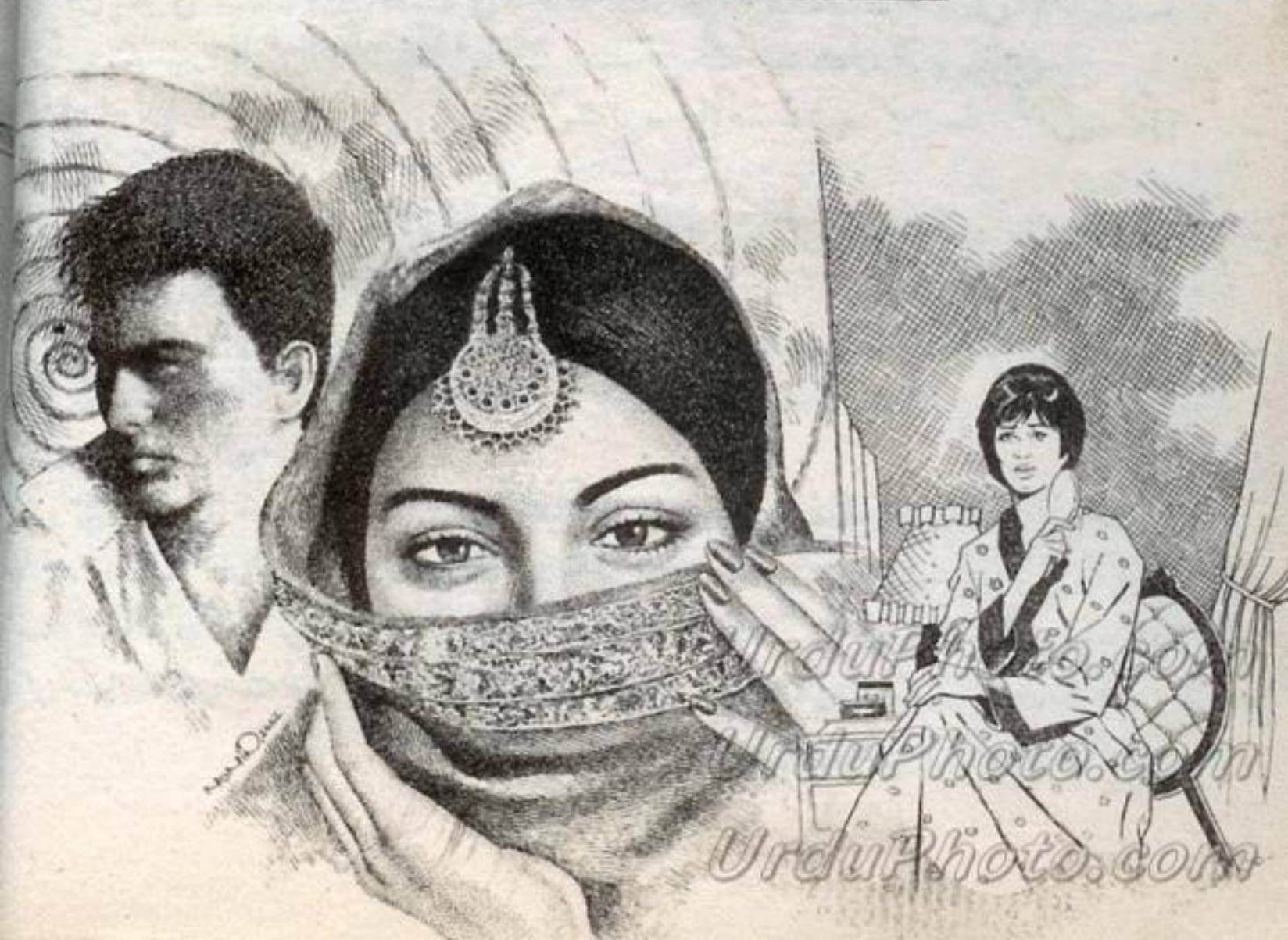
”یہ صرف تمہاری اپنی سوچ کے زاویے ہیں۔۔۔
غلط نہیں ہیں۔۔۔“ وہ سخن ہو گئی۔۔۔ کیا تم
دیکھا نہیں پھولوں میں وہ تازگی ہی نہیں رہی۔۔۔ پھول
اس لمحے ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ اس لڑکی کی آنکھوں
رنگ بزر نہیں زرور بننے لگا ہے۔۔۔ پرندے چھماہ
بھول گئے ہیں۔۔۔ آسمان کا رنگ اب نیلا کیوں نہیں؟۔۔۔
تھا۔۔۔

Scanned By HarfeDua OneUrdu.com

”تمہیں۔۔۔ تمہیں ایسا نہیں لگتا تیمور۔۔۔!
اس شر کے لوگ محبت کرنا بھول گئے ہیں۔۔۔ یہ کہتے
ہوئے اس پر کی نیلے سمندروں جیسی گہری آنکھوں میں میں خلوص نہیں رہا تیمور۔۔۔

خوف بادیاں کستی کی طرح ڈالنے لگا تھا۔۔۔
تیمور نے گلاس وال پھسلتے بارش کے قطروں
سے نظریں ہٹا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا، حالانکہ وہ
اس لمحے ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ اس لڑکی کی آنکھوں
میں ڈالتا خوف تیمور کو ہمیشہ اضطراب میں پیٹلا کرتا تھا۔۔۔
جھول گئے ہیں۔۔۔ آسمان کا رنگ اب نیلا کیوں نہیں؟۔۔۔
تھا۔۔۔

مکمل فاؤں



یہ سبیہ اتنا میلا اور زرد کیوں نظر آتا ہے۔ ہوا کے ہاتھ سے خوشبو کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ نہن بانجھ ہو گئی ہے، اس کی کوکھ سے مٹی کی مکان بنتی نہیں لتی۔“ تیمور کے موبائل پر پیغام آنے لگا تھا جب کہ وہ اب بھی کہہ رہی تھی۔

”تتلیاں ہمارے شرکارستہ بھول گئی ہیں تیمور!“ پھولوں نے کھلتا ہی چھوڑ دیا ہے، ہرنی صبح کی آنکھیں کیسی عجیب کی بے زاری اور اکتا ہٹ ہے۔ جیسے وہ اس نہن پر اترنا ہی نہ چاہتی ہو۔ رات کی اوڑھنی پر ملے ستارے کون فوج لے گیا ہے۔ چاند کی راشنی بہت مدھم ہو گئی ہے۔ کیسی چاندرات سے روٹھنے جائے تیمور! اس طرح مٹی سے خوشبو اور پھولوں سے تتلیاں روٹھ گئی ہیں۔“

تیمور نے پیغام پڑھ کر موبائل آف کیا اور سامنے بیٹھی لڑکی کو قدرے الجھن آمیزانداز میں دیکھا۔ وہ بولنے پر آتی تو یونہی اوت پلانگ بولا کرتی ہی۔ شاید اسے خود بھی خبر نہ تھی، وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اور خوف ان آنکھوں میں کنڈلی ہمارے بیٹھا تھا۔

”حقیقت پسند بنو ارتیح عثمان! تم اکیسویں صدی میں سانس لے رہی ہو۔ دنیا تمہاری انکیوں کی پوروں میں سمت آتی ہے اور تم چاند ستاروں پھولوں اور خوشبوؤں کے لیے پریشان ہو رہی ہو۔“

”حقیقت سیبی تو حقیقت ہے تیمور آنندی کہ اب رشتے مجبوری اور غرض کی بنا پر بمحالے جاتے ہیں۔“ محبت برائے فروخت کا بورڈ سجائے پھر رہے ہیں، ہم سب، کیا محبت جیسی بانٹنے والی چیز خریدی ویتھی جاسکتی ہے۔ ہمارے قول و فعل میں اتنا بھی انک تضاد آچکا ہے کہ میں سوچ کر رہی لرز باتی ہوں۔ کیسی ہمارے انہیں ہماری سزا نہ بن جائیں۔“ وہ ایک دم سسماں کی گئی تھی۔

تیمور پتھملی پر باؤڈل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی اور ارتیح کی آنس کیم پکھل کرپانی ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہ ارتیح کی ذہنی کروکلی میں جلد آس کریم چاہیں گے۔ مگر یہش کی طرح اس کی ذہنی بروکلک چکی تھی۔

ارتیح نے سراٹھا کر اسے دیکھا، مگر اس کے آنے والی بدگمانی نے اڑاؤالا وہ کہہ رہی تھی۔ بھی تھا جو وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ خاموشی کھڑی ہو گئی۔ پھر معدتر خواہانہ بجھے میں بولی۔

”آئی ایم ساری تیمور!“ تیمور نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ ہر روز ہم سے ذرا پسلے وہ خود سے وعدہ کرتا تھا کہ اب وہ اس سے دوبارہ نہیں ملے گا۔ مگر ہر روز یہ عمدہ نفس فائل میں لپیٹ کر اپنی میں تھا شام صرفیت میں پکھ لئے اس دماغی طور پر گھسکی ہوئی لڑکی کے برباد کرنے آ جاتا تھا۔

”چلیں.....“ تیمور نے قدم بڑھا دیے۔ وہ خاصے اس کے ہم قدم تھی۔ برستی بارش نے استقبال کیا۔

”دیکھو ارتیح عثمان! آسمان اب بھی بارش ہے۔“

اس کے دل میں جاگی جسے ارتیح کی آنکھوں میں اٹھ آنے والی بدگمانی نے اڑاؤالا وہ کہہ رہی تھی۔ ”جانتے ہو یہورا مجھے تمہاری آنکھوں میں کیا نظر آتا ہے؟“

تیمور کا پورا وجہ دماعت دین گیا۔ ”اسٹاک ایکچھے کے اتار جڑھاؤ، حصہ شیرزڈار کی قیمت۔“ وہ ہستی چلی گئی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں نہیں نہیں ملے گا۔ تیمور کے اعصاب تن گئے۔ آنکھوں میں در آئی ڈھیر ساری نہیں کو آئتیں سے صاف کرتے ارتیح نے اسے دیکھا۔

”یہی موضوعات ہیں جن کے گرد تمہاری زندگی کے شب و روز گھومتے ہیں، تم یہی دیکھتے اور یہی سوچتے ہو۔“

”تمہارا مطلب ہے؟“ میرے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔“ اس کی آنکھوں اور لبھے میں ہلکی خفی دل آئی۔

”تمہارے موبائل کی بھی اور گھری پر وڑتی نگاہ ہتاتی سے تمہارے پاس کسی کو دینے کے لیے کوئی ایک خالص لمحہ بھی نہیں۔“ تجھے کیوں وہ اتنی سفاک ہو گئی تھی۔

”خالص لمحہ؟“ تیمور کی استفسار میں نگاہیں اس کے چہرے پر گز کئیں۔

”جس لمحے تم جس کے ساتھ ہو تو یورے کے پورے اسی کے ساتھ ہو۔“ اس نے آہنگی سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرالیا، ان کے قریب پیڑ سے نیک لگا کر بارش کے رکنے کا انتظار کرتے شخص نے ایک ورم گھوم کران کی طرف دیکھا۔ ارتیح بارش کی اوت میں کم ہو گئی۔ تیمور آنندی اسے روک کر کہنا چاہتا تھا۔

”ہاں، میں زندگی میں کبھی کسی کو کوئی خالص لمحہ دے سکا۔ مگر وہ ایک لڑکی ہے ارتیح عثمان۔“ میں اس سے جس لمحے متا ہوں تو پورا کا پورا اسی کا ہوتا ہوں۔“ مگر وہ جانتا تھا اس کا بدگمان دل کبھی اعتبار نہ کرے گا۔

”مگر یہ کیسے ممکن ہے؟“ ”کاش! میں یہ لمحہ چڑاں۔“ اک شدید خواہ پھٹک لمحے یونی دیکھتی رہی۔

برستی بارش تھی اور خاموشی۔ اس کی گرفت اک نازک بھیگا سالجھ تھا۔ وہ اس کے سامنے تھی بے خبری میں اس کی زیست کا عنوان بن گئی تھی۔

”کاش! میں یہ لمحہ چڑاں۔“ اک شدید خواہ

بارش میں اپنے قدم بڑھاتے ہوئے تیمور آنندی نے بے حد حیرت سے سوچا تھا۔

”بجوس شدت سے محبت کا متلاشی ہو وہ محبت کو پہچان نہ سکے۔ کیا محبت لفظوں کی محتاج ہے؟“

میں نے پہلی بار اسے بارش کی اوٹ سے دیکھا تھا۔ وہ کون تھی۔ کمال سے آئی تھی۔ مجھے تو ساون کا بادل لگی۔

نہن کی کوکھ سے جنم لیتی مٹی کی خوشبو جیسی۔ بہت ہی ناخالص چلے میں بہت ہی خالص لگی تھی مجھے۔

”جس لمحے تم جس کے ساتھ ہو تو پورے کے پورے اسی کے ساتھ رہو۔“

میں پورے کا پورا اس کی سمت گھوم گیا۔ شاید یہ خواہش اور ٹھہری گھری تھی۔

”جس لمحے تم جس کے ساتھ ہو تو پورے کے اندر را گواری کی لمری اسی تھی۔ میرا دل چالا پہنچا اپنے ہاتھ کو گھورتے، آنکھوں میں بے تحاشا تحریر لے کھڑے اس شخص سے اپنے چھوپوں۔“

”تنہا“ نہ آنے پر افسوس تھا۔ وہ چلا گیا۔ مگر میں اپ بھی وہیں کھڑا ہوں۔ جب بھی ساون کے بادل پچھم سے جھوم کر اگھتے ہیں۔ میرے قدم بے اختیار اسی رستوران کے سامنے حار کتے ہیں۔

مگر اس دن کے بعد وہ کبھی نہیں آئی۔

”مگر میں...
میں اب بھی وہیں کھڑا ہوں۔

نجائے کیوں؟

شم تاریک کرے میں اے سی کی کونگ تھی۔
شیشے کی کھڑکیوں اور دروازے پر دینپر دے پڑے تھے
اپنے ذہن کو تندوٹخ سوچوں کے نوکیے پنجوں سے
چھڑانے کی سعی کرتے ہوئے اس نے کروٹ بدی تو زگاہ
کر شل کی ڈانسنگ گرل پر جا ٹھہریں۔

چند لمحے چکے سے یونہی ٹھہک گئے۔ تب اس نے
باٹھ پر بھا کر بین دیا۔ مدھم میوزک گونجا۔ نیکوں
روشنی نے بڑھ کر گڑیا کو اپنے حصار میں لیا۔ وہ دونوں
پازو آسمان کی سمت اٹھائے اُک دائرے میں گھونٹنے
لگی۔

اسے اپنا آپ بھی کر شل کی گڑیا ہی لگا۔ کتنے برس
گزر گئے اسے ایک ہی دائرے میں چدرا تھے ہوئے۔
کبھی ایسا بھی ہو کہ یہ زندگی وقت کے سودو زیار
سے باہر نکل کر مسکراۓ۔ بھی تو دل کے لبوں پر وہ
ہنسی پھوٹے جو بھار کی اولین خوشبو بھری ساعتوں سے
بوجھل ہو۔ بظاہر وہ جعل، وہ حقیقت بے حد بلکہ پھلکی
اور معطر کہ خوشبو وجہ نہیں ہوتی۔
وہی انہوںی سی خواہش...
اور جب بھی اسے گمان ہو ماکہ اس کے احساسات
اور اس کے اندر پھوٹی محبت، خالص محبت کی خواہش
کر شل کی گڑیا کی طرح جامد، پھر لبی اور ٹھنڈی ہو گئی
ہے۔ ایسی ہی کوئی خواہش سے انہوںی سی خواہش اس
کے اندر سراخھا نے لگتی۔ پھر وہ لاکھ چاہتی کہ اس انہوںی
خواہش کو پیٹ کر رواڑ روب کے سب سے آخری
خانے میں رکھ کر بھولی جائے۔ مگر اس کے اندر طلب
جاگتی تو پھر پھیلتی چلی جاتی۔

UrduPhoto.com
اور سب کتنی حیرت کے سماں تھے پوچھا کر تھے
”ارتیح عثمان سی دنیا کی یا سی ہے۔“
اور، بہت دور تبلیوں کے دیسیں میں وائلن کی وہن
چھلینے لگتی۔

وانلن۔ جس کے سر ہیشہ محبت میں داخل کردکہ
روتے تھے۔

اور ارتیح عثمان نے یہ دھن کئی مرتبہ سنی تھی۔
کہاں...؟

شاید خواب میں، یہ دھن ہیشہ اس کے اندر گوئی
تھی۔

مگر وہ سب کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔
سب بنس دیتے۔ مذاق اڑانے لگتے۔

”نیکھو! ارتیح عثمان پاگل ہو گئی ہے۔ اسے خوابوں
میں اک انجانی دھن سنائی دیتی ہے۔“

جب پہلی بار اسے یہ دھن سنائی دی تو جم کے بارے
ڈرائی فروٹ میں سے کاجو چنتے ہوئے وہ بے اختیار ذکر
کر بیٹھی تھی۔ جم نے اپنا وائلن اس کی طرف بڑھاتے
ہوئے کھا تھا۔

”کیا تم وہ دھن بجا سکتی ہو۔“

جم شجیدہ تھا مگر باقی سب بس دیے تھے۔ اس کا چڑو
خفت سے سخ ہو گیا تھا وہ جانتے تھے۔ ارتیح وائلن
بجانا نہیں جانتی۔

بات تو پچھے بھی نہ تھی۔ مگر مذاق اڑانا ان کی عادت
تھی جہاں جم کے خواب ڈیکی مور اور بیلا کے نام کروز
سے آگے نہ جاتے تھے وہاں ارتیح عثمان کو خواب میں
انجانی دھن سنائی دیتی تھی۔ ان کے لیے تو پاعث
حیرت بھی تھا۔ اور چھ برس گزرنے کے بعد وہ ان کو یہ
نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کے خواب آج بھی اس دھن
کے اسرار میں گرفتار ہیں۔

وہ یہ بات یہور آفندی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔

ہستا نہیں، مگر اپنی آنکھوں میں ہلاکا سا بُسم لیے وہ اس
کی طرف جھک کر جب کھتا۔

”لی پر یکنیکل ارتیح عثمان پیسے۔“

تو اسے یہی لکھا کہ اس کا تمسخر اڑایا جا رہا ہے۔

نجائزہ اتنی نازک مزانج کیوں ہمیں اور بہت بے
اعتبار بھی۔

شاید اس کا مختلف ہونا اسے سب سے دور لے گا۔

جب بچپن میں سب فرنڈز، وڈیو گیم یا اٹھاری کے
دیوانے تھے وہ آیا کی نظر بچا کر چکے سے بھری بیبر
میں لان میں نکل آتی۔ اسے اس برف رنگ تملی کا
انتظار رہتا جو برف کی جھیل سے رستہ بھول کر سخ
گلابوں کے سخ میں نکل آتی تھی۔ اور ارتیح عثمان کی
نفسی ہتھیاروں پر اس کے پوؤں کو چھوٹے کی خواہش
کی جگہ تھی انتظار باندھ کر لوٹ گئی۔ اور وہ ہر روز اسی
خواہش اور انتظار کو سنبھالے سخ گلابوں کے سخ میں
آئی تھتی تھی۔ اور جب تنک مزانج گورنیس اسے
ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک آتی اور اسے سادھوؤں کی
طرح آلتی پالتی مارے چھولوں کو گھورتے پاتی تو ایکدم
چیخ آئتی۔

”وہ بے بی، آریو میڈی... واث آریو ڈونگ ہیز،
اتنی گرمی اور دھوپ۔ اگر مانے دیکھ لیا۔ بلکہ ہم
ان سے تمہاری شکایت کرے گا۔“

”پلیز روڑی۔“ میں سفید تملی۔ ”وہ اتحا کرنا چاہتی
مگر گورنیس اسے بازو سے ٹھیکیت کر اندر لے جاتی۔
امپورڈ ٹیمپو اور صابن سے نہلا، ہلا کر اسے
خوبصورت سفید فرائک پہناؤتی۔ ایک پیل کو اسے غور
سے دیکھتی پھر اس کا گلابی گل چھوکر لیتی تھی۔
”تم تو خود سفید تملی ہو بیل۔“

But I have no wings (لیکن میرے
تو پر ہی نہیں ہیں) ارتیح کے اندر افسوگی سی اتر آتی۔
دروازہ ایک دم کھلا تو اس نے یوں چونک کر اوہر
اوھر دیکھا جیسے اپنے یہاں موجود ہونے پر حیران ہو رہی
ہو۔

”ارتیح! مالی اوسے۔“

اس نے اک طویل سانس لے کر بین آف کیا۔
گڑیا ایک دم ساکت ہوئی تو اسے لگا پورا کمرہ خالی ہو گیا
ہے۔

”تم ابھی تک بستر پر ہو۔“ مہانے پیار بھری نفلی
سے اسے گھورا اور وہ سوچتے گئی مہانے کے لمبے میں
شیرتی کا سب کیا ہو سکتا ہے۔
”طبعیت تو ٹھیک ہے جانو۔“ انہوں نے آگے
تھا۔

بڑھ کر اس کی پیشائی کو دھیرے سے چھووا۔ اُک اجنبی سا
لمس اس کو پیشائی پر محسوس ہوا۔

”آئی ایکم فائن قمی۔“ اس نے پیچھے ہٹ کر کریڈ کی
پشت سے ٹیک لگا کر انہیں دیکھا۔ بلیک ساڑھی،
ڈاگمنڈ کا سیٹ، فریش میک اپ اور جدید ہیر اسٹائل
میں وہ بہت ترو تازہ یگ اور اسماڑٹ لگ رہی تھیں۔
”میو آر لکنگ سوسیٹی نمی۔“ وہ بے اختیار گویا
ہوئی۔

”مختینک یو ڈارلنگ۔“ وہ زناکت سے
مکرائی۔

”آج تو فنکشن میں آپ کے سوا کوئی نہیں
ہو گا۔“ اس نے لاؤ سے دونوں پازووں کے گلے میں
جمال کیے۔ ”سیز فروز تو جل کر راکھ ہو جائیں گی۔“
بیشہ کی طرح اور ہو گئی تھی۔ لیکن وہ بھی کیا کرتی
بازو گلے سے نکلتے۔ ارتیح شرم مند ہو گئی۔ شاید وہ
بیشہ کی طرح اور ہو گئی تھی۔ لیکن وہ بھی کیا کرتی،

”گرتے بالوں کو رکھتا ہے۔“ ”نہ بال رکھتا ہے۔“

”بیوی بکس اور رجیم جو جو گوئیں سے تیار کر دے۔“

سوہنی ہیئی ہیئی اُول

پہنچے 25 سالوں سے ہیں اور بیان، شہزادی بہیزا

سوہنی بیٹہ اُلکے بعد
اپنے کھن کیلے

بیوی بکس اور رجیم جو جو گوئیں سے تیار کر دے۔

سوہنی اُول

بیوی بکس اور رجیم جو جو گوئیں سے تیار کر دے۔

جو آپ کو تھیں تھے حین تر بنائے۔

نگ بکھارے پچھے کو خوبصورت بنائے۔

چھرے کا رنگ بدل کر صاف ور شفاف بنائے۔

سوہنی اُلٹن چھرے اور پانچوں کی خوبصورت کاران

یا آپ کے چھرے کو قدقاشی، جذبات اور وہ کشی شکستے۔

آپ کے چھرے اور پانچوں کی خوبصورت کاران

جس سے آپ کا رنگ بھی بھرا کر دیا جائے۔

اوہ بھر کر دیجئے۔

”ہاتھ میں تو جسٹ۔“

”اوہ بھر کر دیجئے۔“

</div

اے آج تک محبتوں میں حمدندی کرنا نہیں آئی تھی۔

پتو جس سے محبت کرتی اے بے حد و حساب چاہتی تھی۔

”لیکن تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ ہم آں ریڈی لیٹھیں جانو۔“ ممی نے گھری پر نگاہ دوڑائی۔

”بجھے کہیں جانا تھا میں۔“ ”یہ ہمارا ہیڈ ک نہیں ہے ارجح۔“ تمہیں چنانے ہے تو جس کے بعد بھی یادِ بیانی کروائی تھی۔

”اوے۔“ وہ یوں چونکی جیسے بالکل بھول گئی تھی۔

حالاتکہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ روزی ہے اسے می کپار لر جانے کے بعد بھی یادِ بیانی کروائی تھی۔

”سوری ممی! میں وہاں خود کو مس فٹ محسوس کروں گی۔“

”می! اب تو خاصی درپر ہو گئی ہے۔“ ”بالکل دری نہیں ہوئی۔ تم قورا“ اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔“ انہوں نے تکمانتہ لمحے میں کہا۔

”می! آپ فارینہ کو لے جائیں۔ میرا موڈ نہیں ہے۔“ ارجح کے لمحے میں بیزاری کی در آئی۔

”فارینہ عمر کے ساتھ جا چکی ہے۔ اور میں کوئی ایسکیوں نہیں سنوں گی۔ وہاں سب تمہارا پوچھیں گے۔“

”کوئی نہیں پوچھے گا می! وہاں کسی کو کسی کی پروا نہیں ہوئی۔“ اس نے لاپرواں سے کہ کری وی کا رسیوٹ کنشوں اٹھایا۔

”تم خودا میں نظر انداز کرنے لگی ہو۔ نجانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہو۔ حلیہ دیکھا ہے اپنا، کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔“ تم نے پار لر کا چکر نہیں لگایا۔ تمہیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ تمہارے یاں کا حشر ہو چکا ہے، لوگ مذاق اڑاتے ہیں تمہارا ارجح۔“ ممی کو ایک دم بو جمل پکلوں کے نیچے براون آنکھوں میں تحریر سا جاگا۔

”وسرے پل وہ تحریر طنز میں بدل گیا۔“

”می! غصہ مت کریں۔ اسکن پر سلوٹین پڑ جائیں ائینڈ کرنا چاہیے تھا۔“ اس نے اسک کے لباس سے غصہ ایک دم کافور ہو گیا ارجح بدھ سامکرا۔

”اوے۔“ وہ حد آرام سے کویا ہوئی۔ ممی کے چڑے سے ہم رنگ شید چیک کرنے شروع گردیے۔

”پر امس آنکھی بارچلی جاؤں گی۔“

”واثنان سنیں ہے۔“ ممی کھڑی ہو گئیں۔

”ممی! شاستہ آنٹی میں کیا بمالی تھی۔ جو عباس انکل نے دوسری شادی کریں۔“ ارجح نے بے اختیار سوال کیا۔

”یہ ہمارا ہیڈ ک نہیں ہے ارجح۔“ تمہیں چنانے ہے تو۔“

”سوری ممی! میں وہاں خود کو مس فٹ محسوس جھٹک کرنا کچھ کہے باہر نکل گئیں۔

”ارجح پیشانی مسلتے ہوئے اٹھی۔ روم ریفر بچیر سے

اور جوں کا پیک نکال کر وہ گلاں وندوں کے قریب آئی۔“ پر وہ سچنخ کر اس نے دھرتی پر اترتی رات کے

ایتدی قدم گنتے ہوئے عباس اور شاستہ کو سوچا۔“

انکل عباس تھے جو اک ڈنپاری میں شاستہ فیروز کو دیجے کر اپنا آپ بھول گئے تھے۔ دو سال کا دھواں دار عشق ان کی شادی پر جا گر کا۔ اور آج وہی انکل عباس کہتے تھے۔

انہیں لائبہ فہیم کی سیاہ آنکھوں نے لوث لیا۔

”کیا محبت مر سکتی ہے۔“ تین سال کے عرصے میں اپنا وحوہ کھو دینے والے جذبے کو محبت کما جاسکتا ہے۔“

اور نجانے کیوں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اس نے گاڑی کی چالی اٹھائی اور اسی جیلے میں ”عباس والا“ پہنچ گئی۔

”اوہ ہنی! تم یہاں کیسے؟“ شاستہ کی مسکارائے بو جمل پکلوں کے نیچے براون آنکھوں میں تحریر سا جاگا۔

”میں تو اس وقت اپنے انکل کی شادی کافنکشن میں اٹھایا۔ تب ہی ملازمہ دستکارے کر آئی۔“ اس نے اسک کے لباس سے غصہ ایک دم کافور ہو گیا ارجح بدھ سامکرا۔

وہ شدھری کھڑی اس عورت کو دیکھتی رہی، جس سے اپنے ذہن میں اللہ آنے والے سوالوں کے جواب لینے آئی تھی۔ سخیلویں میکسی میں بھرپور میک اپ کو وہ فائل ٹیچ دے رہی تھی۔ ہم رنگ لپ اشک سے اس کے لداز بھرے بھرے ہونٹ دکنے لگے تھے، وہ بھی قیامت تھی۔

باول سے رول اتارتے ہوئے اس نے ڈرینگ نیبل کے آئینے میں اپنے عقب میں کھڑی ساکت و صامت اور گرمِ قسم کی لڑکی کو دیکھا۔

”میں اب بھی سمجھ نہیں پائی ہوں کہ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ ارجح نے چالا، وہ اپنے ذہن میں ابھرتے سوالوں میں سے کوئی ایک سوال اس کے سامنے رکھ۔

کوئی ایک گردہ توکھے۔

مگر اس کے سارے سوال پرندوں کی طرح اڑ گئے۔

بس خالی آسمان تھا اور باتی رو جانے والی پھر پڑھا۔

”وہ بڑھا سمجھتا ہے کہ شاستہ اس کے بغیر مر جائے گی۔“ وہ نہ سے مالی فٹی ہزاروں مرو آج بھی میرے طلبگار ہیں۔ میں دکھادوں گی اسے۔“

وہ ہیرش سے بال سنوار کر کھڑی ہو گئی۔ زر اسالرا کر اس نے اپنے قیامت دھلتے حسن کو آئینے میں دیکھا اور تفاخر سے مسکرا۔

”کیوں ڈارنگ ایں کچھ غلط کہہ رہی ہوں۔“

”آپ۔ آپ تو محبت کرتی تھیں ان سے۔“ وہ بمشکل کہ سیالی شاستہ کا انقری قبضہ بیڈ روم کی خاموش فضائیں بکھر گیا۔

”کرتی تھی میری جان! انگراب لگتا ہے، وہ صرف میری حمact تھی۔ جلد بازی میں کیے جانے والے فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ اس شخص نے مجھے کریڈٹ کارڈ کی طرح استعمال کیا۔ میں نے بھی اسے ٹشوپیکری طرح دستہ بن میں نہ پھینکا تو میرا نام شاستہ نہیں۔“

لیخ لیجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنا چھوٹا سا پرس اٹھایا۔ تب ہی ملازمہ دستکارے کر آئی۔

”بیگم صاحبہ! جواد صاحب آپ کا گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں۔“

”آئی ہوں۔“ اس نے پلٹ کر ایک بار پھر تقیدی نگاہوں سے اپنا جائزہ لیا۔ پھر ارجح کی طرف پڑھ۔

”سوری ڈر مجھے جانا ہو گا۔“

”میں بھی چلتی ہوں۔“ وہ آستگی سے گویا ہوئی۔

”مریج ڈیں!“ شاستہ نے آستگی سے اس کا کندھا تھیپھایا۔

”تیمور اچھا لڑکا ہے اور مختلف بھی۔“ شاستہ نے اس کا گال تھیپھایا۔ اور گذبائے کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ خاموشی سے کھڑی سوچتی رہی، شاستہ نے تیمور کا ذکر کیوں کیا۔ ست روی سے چلتی ہوئی وہ گاڑی تک چلی آئی۔

”لیکن میں نے تیمور کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا۔“ دروازہ کھولتے ہوئے وہ زیر لب بڑھا۔“

”تو کیا تیمور۔“ اس کا ذہن عجیب کی سوچوں کی آنماگاہ بن گیا تھا۔

بہت دیر تک تاریک سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد بھی اس کا دل گھر جانے کو نہ چالا تو وہ جمیشید کی طرف آگئی۔ گیٹ چوکیدار نے کھولا۔ جمیشید اپنے چھوٹے سے خوبصورت لان میں تھا بیٹھا تھا۔ اس کا وانلن بے حد خاموش سا گھاٹ پر رہا تھا۔ اس کے گروپیلی اشیاء پتلتی تھیں وہ سب کچھ تھے قبل یہیں تھے۔

”بائے جم۔“ اپنے سامنے رکھے خالی گلاں کو بھرتے ہوئے جمیشید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور مسکرا۔

”بائے ارجح! تم تو دوستوں کو بھول ہی گئی تھیں۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کہاں کئے سب لوگ۔“

”ہارون اور جنون کا نشرت ہے“

”اوہ سمجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ اس نے

نجانے کیوں شکوہ کیا۔ جمشید نے سراخا کر بے حد

حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ نظریں چڑائی۔ جمشید نے

بھی پچھے نہیں کہا۔

”پچھے لوگی۔“ بہت دیر کے بعد جمشید نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تیمور کیسا ہے؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ وہ چڑکریوں۔

”کیا ہوا؟“ اس کامزاج عجیب تو تھا مگر آج بالکل

ہی بدلا ہوا تھا۔

”میں تیمور کی سیکریٹری نہیں ہوں۔“ وہ بگز کریوں۔

”ہی ازیور بیست فرنٹس۔“

”جسٹ ایزو جم۔“

جمشید کچھ تھے اسے دیکھا رہا۔ ”وہ تمہاری بہت کیسر

کرتا ہے ارتچ۔“

”سوواٹیں تم نہیں کرتے۔“

جمشید خاموشی سے اسے دیکھا رہا۔

”تم نے کسی سے محبت کی ہے ارتچ۔“ اس نے

ایک دم پوچھا اور محبت کا جو روپ وہ ابھی دیکھ کر آئی

تھی، اس کا دل چلنا دل کھول کر قیقدہ لگائے۔ مگر وہ بند

لبیوں سے اسے دیکھتی رہی۔ شاید محبت کی اتنی توہین

گوارانہ تھی۔

”مجھے محبت ہو گئی ہے ارتچ۔“ وہ اس کی آنکھوں

میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ارتچ ساکت رہ گئی، پلکیں بھی

نہ جھپک سکی۔ حالانکہ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔

”پچھے ماہ بُل تھیں شری بالوں والی لیتا سے بھی

محبت ہوئی تھی۔“

”مجھے ارباب سے محبت ہو گئی ہے ارتچ۔“

نجانے کیوں ارتچ کو لگاتا تھا، یہ واٹن نوازا ایک سچا

عاشق ضرور ہو گا مگر شاید وہ مبارے اندرازے پاندھی

ہی اسی لیے تھی کہ وہ غلط ثابت ہوں۔

وہ کب سے یہ میونیڈ کا گلاس ہاتھ میں لے وسیع و

ہوتی۔ ممانتے تھی سے منع کیا تھا۔

عیریض لان میں برستے چھاہوں چھاج ساون کو دیکھ رہے

تھی۔ سیاہ کولیار کی سرکار پر بارش آزادانہ ہوا کی پانچ

باندھے محور قص تھی۔ یہاں اس کی تھائی میں پانچ

ہونے والا کوئی نہ تھا۔

اسے بارش کی بوندوں میں اداسی پیکتی سنائی دی۔

تیز ہوانا راض ہو کر پھولوں سے ابھننے اور ان کے

پیراں بکھیرنے لگی۔

ساؤن میں سرما کی جھڑی جیسی اداسی، تھائی اور

بیزاری نہیں ہوتی۔ وہ تو امید بھرا منتظر ہے۔

خوشی کا دوسرا نگہ۔

جلی بلتی نہیں کا قرار

بیزار اور تھکے، متے ذہنوں کا سکون۔

ساؤن کی تیز بارش میں کہیں دور بنتے والے محبوب

کا منتظر نہ ہو تو ساؤن بے کار۔

اس کی تیز بوجھاڑیں کسی کنواری کے گلابی بدن

رنگ بنتے ہلے تو ساؤن بے رنگ

سکھیوں کی چھپل بھی، آم اور جامن پر پڑ

جو ہلے ہوں تو ساؤن پھیکا۔

پیڑوں کی گلی شاخیں اوڑھ کر کوئی کوئی کسی کے

من میں ہوکر نہ جگائے تو ساؤن اداس۔

اس نے باہر رہتی بے رنگ، پھیکی اور اداس بارش

کو دیکھا۔

ساؤن میں تو بانٹ لینے کی خوبی۔ شیر کرنے کی

کیفیت۔ وہ نہیں سے اس کی پیش بانٹ لیتا ہے

محب سے محبوب کا منتظر

گسکی کی آنکھ جو اداس ہے تو وہ اس آنکھ میں نہیں

کر پھیل جائے گا۔

کوئی ترس رہا ہے تو تکل کر برس جائے گا۔

ارتچ کا دل چلاؤ یا ہر نکل جائے۔

ہنسے ہگائے شور کرے۔

اس کی اداسی ساؤن کی ساری اداسی بانٹ لے۔

اس کا دل لانگ ڈرائیور پر نکل جانے کو چاہ رہا تھا۔

مگر ساری خواہشیں پوری ہونے کے لیے تو نہیں

”بھاٹ تم کہیں اور برس جاتے۔“

اسے بارش کی ناقدی کا دکھ ساہو۔

بچپن میں جب سرمی پاہل کھل کر برستے تو بارش

میں بھیکنے کی ہوک اسے لان کی طرف بھیختے لگتی۔ مالی

کی بیوی جو ہے پر کڑا ہی چڑھائے چھوٹے چھوٹے

پکوڑے ٹلنے لگتی۔ اس کے ہر سائز کے چھوٹے بڑے

بچے بارش میں چھپا چھپ اور ہر سے اور ہر بھاگتے۔ اور

وہ بچی سب سے نظر پجا کر وہیں نکل آتی۔ چولے کے

پاس پھر زار امار کر پکوڑے کھانے مگر وہ خوشی بس لھاتی

ہوتی۔ اسے ڈھونڈنے سارے گھر میں ملازم و وڑپڑتے

اور روزی کسی جن کی طرح کو اڑ کے برآمدے میں

نمودار ہوتی۔

بھی جو ماما موجود ہو تیں تو اپنا سر پیٹ لیتیں۔

”کیا ملتا ہے تمہیں ان جلال، ان پڑھ اور گندے

لوگوں میں بیٹھ کر۔“

اور وہ اس وقت اتنی چھوٹی تھی کہ یہ نہیں بتا سکتی

تھی کہ اسے گندے لوگوں میں بیٹھ کر کیا ملتا ہے۔

”سارے کپڑے بھگو لیے ہیں اگر بیمار ہو گئیں

تو سر روزی چینچ کر اداس کو۔“ وہ چیخ کر کھتیں۔ پھر زیر

لب بڑیڑا تھیں۔

”کیا عجیب مزاج ہے اس لڑکی کا۔ شاید میں نے

یہ غلطی کی۔“ تجاذب انہوں نے کون سی غلطی کی

بھی۔ اس کے اندر تو ایک ہی سوال مچتا رہتا جواب

بھی یونہی اس کے لیوں تک آگیا تھا۔

”ساؤن میں نہا کر بھی کوئی بیمار ہوتا ہے می۔“

وہ سرے پل اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ می نے

لے بڑی طرح گھورا۔

وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔ سورنہ خبر

تو ہوتی کہ کمرے کا ماحول کب تبدیل ہو گیا۔ خوش

گپیوں میں مصروف افراد کے تیور کیوں بدلتے۔ اول تو

ان کا کھٹے ہوتا ہی جیران کن تھا۔ عامر بے حد سچیدہ

تھا۔ فارینہ تیار نہیں ہے۔ چنچھت کہتی ہے

احمد۔ اسے ابھی اندازہ ہی نہیں کہ ماں بننا کیا ہے؟“

”تو کیا وہ۔“

”لیکن یہ سب بہت جلدی ہو رہا ہے۔ میں اس

کے لیے مینٹلی تیار نہیں ہوں۔“ نک چڑھی فارینہ

اس وقت چریشان اور بولکھانی ہوئی تھی۔

”تو ماہ چک ٹھاک عرصہ ہوتا ہے خود کو تیار

کرو۔“ ممانتے لجھے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

”مگر ابھی ہمیں ورلڈ ٹور پر لکھنا تھا۔“ اس نے مدد

طلب نگاہوں سے عامر کی سمت دیکھا۔ وہ کندھے اچھا

کر رہا گیا۔

”بعد میں اس قابل رہ جاؤں گی میں۔“ وہ تنگ کر

بولی۔

”تمہیں کچھ نہیں کرنا فارینہ۔“ ممانتے محبت سے

اس کا ہاتھ تھا۔

”اپنی بھی مجھے کچھ نہیں کرنا۔“ فارینہ طنزیہ انداز میں

کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں خود دا کمزیوں سے بات کروں گی۔“

”میں کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

فارینہ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بھی میں ہی!“ وہ آنکھی سے کہہ کر ہر نکل گیا۔

”بچھے۔“ ارتچ بڑی طرح چوٹکی۔ پھر ممی کی طرف

پاشی۔

”میں! اس بچے کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ می نے

مکر اکر کر سی کی بیک سے سرٹکا کر آنکھیں موند لیں

اور اطمینان بھرے لجھے میں گویا ہوئیں۔

”شی از ریکنٹ۔“

”ریٹکی قمی!“ وہ جوشی میں ان کے قریب آئیں۔

”وہیں گریٹ!“ اسے واقعی بے حد خوشی ہوئی تھی۔

”فارینہ تیار نہیں ہے۔ چنچھت کہتی ہے

احمد۔ اسے ابھی اندازہ ہی نہیں کہ ماں بننا کیا ہے؟“

”تو کیا وہ۔“

”نیخیر یہ تو میں ہونے نہیں دوں گی۔ یہ بچہ اس دنیا

میں ضرور آئے گا۔“ وہ مصمم لمحے میں گویا ہوئیں۔
”می! آپ گرینڈ میرن جائیں گی۔ اتنی جلدی۔“
وہ جانتی تھی می اپنی عمر کے بارے میں لکھی کونشنس
ہیں۔“ کوئی بات نہیں، مجھے اچھا لگے گا۔“
ارتچ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ میک اپ سے
مبرا دھلا دھلا یا چڑھے چڑھے کے نقوش میں اک ماںوس
زی کاسا تاڑ۔

اسے پہلی بار سامنے بیٹھی عورت مال گئی۔
”اور تم نے کیا سوچا ہے ارتچ۔“ وہ بہت دیر تک
یونہی انہیں دیکھتی رہتی اگر نہیں بول نہ اٹھتیں۔

”کس بارے میں؟“ وہ پیچھے ہو کر بیٹھی گئی۔
”شادی کے بارے میں، عامر تم سے چھوٹا تھا۔ مگر
اس نے شادی کر لی، اپنے پہاکا بزرگ بھی سنچال لیا۔
اور تم وہیں کی وہیں ہو ارتچ۔“ می نے بہت سالوں
سے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا آج پھر گھیر کر
بیٹھ گئیں۔

”میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا می!“ وہ
کیوں نہ کھرتے گئی۔

”وفیصلہ کیوں نہیں کر لیتیں۔“ کتنے لوگ تم میں
اندرستہ تھے مگر تمہاری بے انتہائی و بے رخی کی وجہ
سے سب ہاتھ سے نکل گئے۔ آخر تک چاہتی کیا ہو۔
پونیور شی تم نے چھوڑ رکھی ہے کہ موڈیں، آفس تم
نہیں جاتیں کہ بزرگ تمہارا مزار ج نہیں۔ اور کچھ نہیں
تو شادی ہی کرلو۔“

”شادی ضروری ہے می؟“۔“ وہ بیزاری ہو گئی۔
”جبت ضروری ہے اور اس بات کا دوراک نہیں
تھا ہو گا جب میں نہیں رہوں گی۔“ می نور دے کر
بولیں۔

”می! بلیز! انوار موسنل ملک مینگ“ *UrduPhoto.com*
”ارتچ مالی لو!“ انہوں نے محبت سے اس کا چڑھا
اس کے ساتھ چل دی۔ اپنے غموں کے ساتھ ساتھ
چھوٹنے والی ہوں تو مجھے لگا خدا ابھی تم لوگوں سے
لپنے باخوبی میں لیا۔“ *UrduPhoto.com*
”تمہارے یہاں کے بعد ان کا بزرگ میں نے سنچالا
تھا ورنہ سب بڑا ہو جاتا۔ میں چاہتی تو شادی بھی
”خوشی کا سبب جان سکتا ہوں میں۔“ *UrduPhoto.com*

کر سکتی تھی۔ مگر نہیں کی۔ صرف تم دونوں کی خاطر
اپ سارا بزرگ عامر کے ہاتھ میں ہے۔ بزرگ کی
تمہیں کوئی شدید نہیں، ایجوکیشن تم نے کپلیٹ
وراس سے کھانے کا پوچھنے لگا۔
”ایزی یو ش۔“ ارتچ نے آرام سے کہہ دیا۔ اسے
نہیں کی۔ شادی تم کرنا نہیں چاہتی آخر میں تمہاری
سیکیورنی کے لئے کیا کریں یہ فارینہ تمہیں ہر چیز سے
الکل انداز نہیں ہوا کہ یہور نے ہر دش اسی کی پسند کی
بے خل کر دے گی۔“

”می! عامر میرا بھائی ہے۔“ اس کے لمحے میں
رشتوں کامان بول رہا تھا۔ می نے مضمحل سائل کا رک
”کیوں میرا اس سے کوئی لعاق نہیں۔؟“ وہ خفا
ہی ہوئی۔

”تم بہت انوینٹ ہو ارتچ۔ اسی لیے میں چاہتی
ہوں، تم شادی کر لو۔“ وہ خاموش ہی رہی۔
”یہور کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟“
”اصحاحا ہے لیکن۔“

”لیکن۔“ می نے اس کی بات قطع کی۔ ”ارتچ!
تم کس تم کے آئیڈیل زم کا شکار ہو۔ یہ آئیڈیل پچھو
نہیں ہوتا ہے پچھو اور اندر سے پچھو اور۔“
”تو دو غلے لوگوں کے ساتھ زندگی کیسے گزاری
جائے میں۔“ اس نے سراخا کر سوال کیا۔
”اعتبار تو کرتا ہے جانو۔“

”ہو بھی تو سکتا ہے۔“ اس نے ٹولتی نگاہوں سے
ہمال بیٹھے مجھ سے یہ سوال کر رہے ہو گے۔
”اوروہ یہی سوچتے ہوئے اٹھ گئی تھی کہ۔“ اعتبار ہی
ارتچ کو دیکھا۔
”تو نہیں آتا۔“

”میں یہور!“ وہ سنجیدہ سی ہوئی۔ ”ہمارے طبقے
کے مردوں کی محبت میں گنجائش ہی تو نہیں ہوتی۔ نیلی
آنکھوں کے بعد کالی آنکھوں کے سحر میں گرفتار
وجاتے ہیں۔ دو سال بھی نہیں لگتے محبت دم توڑ دیتی
ہی تھی۔ یہور نے اس کے گالابی ابوں پر کھلتی مسکان
کو دیکھا تو مسکرا دیا۔ آج پھر بہت سے مصروف لحوں
میں سے چند لمحے خاص اس لڑکی کے لیے نکال کر لایا
اندر۔“ اتنی بے اعتباری کمال سے آگئی ہے تمہارے
تھا۔

”لچ پر چلیں یہ۔“ یہور نے کھاتو وہ جوان ونوں اس
مسکرا کر بات بدلتی۔“ وہ خاموشی سے ویژہ کو سرو کرتے دیکھتی رہی۔ ویژہ کیا
سے چڑھی ہوئی تھی اس وقت اتنی خوش تھی کہ فوراً

”ارتچ مالی لو!“ انہوں نے محبت سے اس کا چڑھا
اس کے ساتھ چل دی۔ اپنے غموں کے ساتھ ساتھ
چھوٹنے والی ہوں تو مجھے لگا خدا ابھی تم لوگوں سے
لپنے باخوبی میں لیا۔“ *UrduPhoto.com*
”خوشی بھی یہور کے ساتھ شیر کرنے کی عادت سی پڑ گئی
ایوس نہیں ہوا۔ فارینہ جو بھی کہے لیکن وہ میرے لیے
تھا اہم ہو گا۔ مجھے تو ابھی سے اس کا بہت انتظار
”خوشی کا سبب جان سکتا ہوں میں۔“ *UrduPhoto.com*

”آئی ایم فائن سے“ وہ کہہ کر تیمور کو دیکھنے لگی۔
نجانے وہ اسے یہاں کیوں لاایا تھا۔ وہ اور ظمیر باتوں میں
مُگن ہو گئے تھے ڈاکٹر تابندہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اوہ ہم پچن میں چلتے ہیں۔“

ارتیج کو یاد نہیں اس نے آخری بار اپنے گھر کا پچن
کب دیکھا تھا۔ اور اب تابندہ نے پچن میں رات کے
کھانے کی تیاری کرتے خانہ مال کو مار کیٹ پچھ پیزول
کی لست دے کر بھیج دیا۔ اور خود فریزر کھول کر اندر
سے چیزیں نکالنے لگیں۔

”کیا آکر تی ہو تم؟“

وہ جو بھے سجائے پچن کا جائزہ لینے میں مصروف
تھی، چونکہ تھی۔

”پچھ بھی نہیں۔“

”تیمور تمہارا اکزن ہے۔“

”نہیں فرینڈ۔“

”جسٹ فرینڈ؟“ وہ مسکرا کر بوچھنے لگیں۔ ارتیج
متذبذب سی انہیں دیکھنے لگی، آخر اس سوال کا کیا
جواب دے۔ وہ بھی گویا اس کا متذبذب پا گئیں۔ تب
ہی مژکر رنگ جلانے لگیں۔

”آپ خود ہی کونگ کریں گی۔“

”عام طور پر تو وقت ہی نہیں ملتا۔ صبح ہسپتال، شام
میں ٹکینک، پھر ظمیر بھی بہت مصروف ہوتے ہیں۔
بس بھی کبھار ہی مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے
ظمیر کھر پر ہوں تو میں ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے پچھے
نہ پچھ ضرور بناتی ہوں۔ ویسے میں اپنی کونگ کر لیتی
ہوں۔ تیمور کو میرے ہاتھ کے پچھے قیمے کے کتاب
بہت پسند ہیں ابھی بھی وہی بیٹا رہی ہوں۔“

”آپ کے بچے؟“ اس نے یونہی بات بڑائے بات
کی۔ لیکن ڈاکٹر تابندہ کا مسکرا تاچھہ تاریک ہو گیا۔
”ہمارے اولاد نہیں ہوئی۔“

”لوہ آئی ایم ساری۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”لوہ اس اور کے ہمیں تو دس سال ہو گئے اس حقیقت
کو تسلیم کیے ہوئے۔“ انہوں نے فرانگ پین چولے
پر رکھ کر فریج سے کیک نکال کر ٹھالی میں رکھا۔

”وس سال... آپ کی شادی کو اتنا عرصہ ہے
ہے۔“ ارتیج کو حیرت سی ہوئی۔ دیکھنے میں وہ خا
پچ نظر آئی تھیں۔

”ہاں اور شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی
معلوم ہو گیا تھا کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔“

”ظمیر بھائی کو بھی معلوم ہے۔“

”ظاہر ہے“ میں ان سے چھپا تو نہیں سکتی تھی۔
اس کے بعد ہی انہوں نے میرا میڈیکل میں ایڈ پڑ
کر واپس تھا مگر میں مصروف ہو جاؤں اور مجھے اس
بارے میں سوچنے کا بھی وقت نہ ملے۔ حالانکہ جو
ہے وہ ہے اسے سوچنے کے لیے وقت نکلنے
ضرورت تو نہیں پڑتی۔ ”ان کا لمحہ پھیکا سا تھا۔ اور
بے حد متحیر سی سوچ رہی تھی۔ اس کے باوجود ظمیر
اس عورت کے ساتھ دس سال گزار دیے۔

تابندہ بتا رہی تھیں۔

”میں بخوبی اجازت دینے کو تیار تھی۔ مگر میری کو
ضد کوئی دلیل ان کی محبت کو ہڑانہ سکی۔ نجانے یہ
محبت ہے ان کی۔ وہ کہتے ہیں، تم اس کی کے ساتھ
زندگی گزار سکتی ہو تو میں کیوں نہیں۔ اگر خدا نے ادا
دن ہوتی تو تمہی سے دیتا۔“

تابندہ روں تلنے لگیں۔ وہ میز کی سطح پر نظر
جمائے نجانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

”میں بھی کیا باتیں لے بیٹھی، تم بتاؤ کہیں انگلی
ہو۔“ ڈاکٹر تابندہ نے بات بدلتی۔

”نہیں سب سے“ ارتیج نے مختصرًا کہا پھر بوچھنے لگی۔

”آپ کوئی بچہ ایڈ ایٹ کیوں نہیں کر رہیں۔“

”ظمیر تو چاہتے ہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ وہ دوسری
شادی کر لیں۔ اپنی اولاد کی بات اور ہوتی ہے۔ دیکھیں
ہم دونوں میں سے کس کی محبت جیتی ہے۔“

”بیگم صاحبہ! کچھ رحم کریں مہمانوں پر یا انہیں
یونہی بھگانے کا ارادہ ہے۔“ ظمیر پچن میں جھانک
کر گولے۔

”بُر میں ابھی لے کر آئی، وو منٹ۔“

باؤں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔
انہوں نے کتاب اور رول ڈالی میں سجائے۔
”آپ کے سرال والے؟“ ارتونج ہوئیں انگلی تھی۔
”سارا زمانہ ایک طرف اور ظییر کی محبت ایک طرف۔“ ڈاکٹر تابندہ کے لمحے میں فاخر سالہ آیا۔
”او، چاہئے پیتے ہیں؟“ وہ خاموش سی ان کے ساتھ بیہر آگئی۔ تیمور نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی وہ نظر انداز کر کے تابندہ کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

وابسی پر تابندہ نے بہت اصرار کے ساتھ اسے دوبارہ آنے کا گما تھا۔ تیمور نے اس کی طرف سے اگلے دیکھا۔

”کیسے لگے یہ لوگ تمہیں؟“ وابسی پر تیمور نے پوچھا تھا۔
”وری نائس۔“ اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

”مگر یہی ویک اینڈ پر چلوگی۔“
”دیکھیں گے۔“ وہ سخ موڑ کر بیہر دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی تیمور سے یہاں کیوں بیٹھا تھا۔

♥ ♥ ♥
اگلی صبح اس نی بخراں کی منتظر تھی۔
رباب کو فواد نے پروپوز کیا تھا اور اس نے فواد کا پرپوز قبول کر لیا تھا۔ جمشید بے حد ڈشرب تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح اس کے آنسو ارتونج ہی کو صاف کرنے تھے۔ اس نے فون کر کے پرپوز کے بارے میں بتانے لگی۔
”لیکن ربایپ! تم تو جمشید سے محبت کرتی تھیں۔“
”بال کرتی تھی۔“ وہ بس دی۔ ”وراصل تے جمشید کہہ رہا تھا کہ اس کے ڈیڈی کے ساتھ اس کی صلح ہونے والی ہے۔ لیکن اب پتا چلا کہ اس کے ڈیڈی اس سے اتنے تک آگئے ہیں کہ ایسے عاق کرنے والے ہیں۔ پھر فواد کا پرپوز آگیا۔ اور تمہیں تو پتا ہے یا اس کی فیکلی کیا چیز ہے اور خود اس کا فیوج کتنا براہت ہے۔ ممکنا کا خیال ہے میرے لیے فواد ٹھیک رہے گا۔ وہ امریکہ سے آجائے تباہی میں ہے۔ جوانے بیڈ روم میں حیلہ پکھ اور جلا رہا تھا۔ ارتونج نے روپے شاکر بیڈ روم کے یا سیت زدہ ماحول کو بدلنے کی کوشش کی۔ سی ڈی پلیسیر میں سے روپی دھوکی ہی۔ ڈی نکال کر اس پاسی گرل کا نیا الیم لگا کر وہ ایوم فل کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھ سے مگ پھینٹے ہوئے بولی تھی۔
”چلو جائیں کہم کھانے جائے ہیں۔“ ان ہی سوچوں میں ابھتی وہ گھر پیشی تو ملازم نے بتایا کہ عامر اور مگی فارینہ کو لے کر ہستال گئے ہیں۔

”وہ تو صحیح سے ہی چلے گئے تھے۔“ وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔
آج سولہ اگست تھی اور ڈاکٹر نے فارینہ کو یہی ڈیٹ جاتی تھی۔ اس نے فارینہ کے لیے ڈھیر سارے پچھوں خریدے اور ہستال آگئی۔
”میں اور عامروینگ روم میں تھے۔“

”میں۔“ وہ ان کے قریب جا رکی۔ مگی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر ہستال سے گویا ہو گیں۔
”فارینہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“
”وہ گاٹی۔“ ارتونج نے مضھل سے عامر کو دیکھا پھر اس کے پالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے تسلی آمیزانداز میں بولی تھی۔

”دونٹ وری عامر! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
عامر نے یونہی اثبات میں سر بلایا اور اٹھ کر اوہر سے اوہر چکرانے لگا۔
”مگر می ڈاکٹر تو کہتی تھیں کہسے۔“
مگی اس کی بات سننے کے بجائے باہر آئیں ڈاکٹر شفاء طارق کی طرف متوجہ ہو گئیں وہ ان کے قریب آکر رک گئیں۔
”آئی۔ ایم ساری مسز عثمان! ہم بے بی کو نہیں بچا سکے۔ بیٹھا مل مردہ۔“

ارتونج کو لگا ساری کائنات تھم گئی ہے۔
اس نے پل پل اس کا انتظار کیا تھا، اسے لگتا تھا یہ پچھا ان کی گھر کی فضا کو خوشنگوار بنادے گا۔
”پیسے نہیں ہو سکتا۔“ اس کے ہاتھ سے پچھوں گر کر فرش پر بکھر گئے۔
”فارینہ ٹھیک ہے؟۔“ عامر پوچھ رہا تھا۔
”لیں شی ازاں رائٹ۔“

وہ ووقدم پیچھے ہٹی۔ اس کی بے یقین نگاہوں نے سامنے کھڑے تینوں افراد کے مغموم و ریشان چڑوں کو دیکھا۔ اور بھاگتی ہوئی وہاں سے باہر نکل گئی۔

♥ ♥ ♥
”تم نے دیکھا۔ تم نے دیکھا تیمور۔ وہ اس دنیا کو دیکھے بغیر چلا گیا۔ اس نے ایک نظر بھی کسی کو دیکھنا کو اوارہ

نہیں کیا۔ وہ یونہی روٹھ کر چلا گیا۔ وہ جانتا تھا، یہاں کوئی اس کا منتظر نہیں۔ یہاں کسی کو اس کی ضرورت نہیں۔ لیکن تیمور ایسے اس کا انتظار کیا تھا مجھے ضرورت تھی اس کی۔ ”اسے رونے کے لیے وہی کندھا لاتھا۔

”سبھاں لو خود کو ارتونج! فارینہ کو دیکھو۔ اس نے کتنی جلدی خود کو سنبھال لیا ہے۔“

”میں نے اس کا نام ہی غلط رکھا تھا۔“ ”عدن“ جنت کا پھول۔ وہ جنت کا پھول تھا اس لکھیا سی دنیا میں کیا کرنے آتا۔“

”چلا ارتونج! ڈاکٹر تابندہ کے ہاں چلتے ہیں۔“ تیمور نے اسے بہلانا چاہا۔

”نہیں تیمور! پھر بھی چلیں گے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”ارتونج۔“ تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔ ”او، کہیں دور چلتے ہیں بہت دور جہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی نہ ہو۔“ اس نے پہلی بار کوئی فرماش کی تھی۔

”کہاں نہیں کے آخری کنارے تک، یا سورج سے اپنا دکھ بانٹنے۔ ہم جہاں بھی گئے تیمور تھا نہیں ہوں گے۔ اگر سورج نے بھی ہمارا دکھ نہ باشنا تو کہاں جائیں گے۔“

تیمور نے اسے کھینچ کر واپس بٹھایا اور جھنجلا کر پوچھنے لگا۔

”کس قسم کی باتیں کرتی رہتی ہو تم۔ یہ سب فارغ داغ کے کر سئے ہیں۔ بے مقصد جیتے کے نقصانات ارتونج عثمان، کل تم میرے ساتھ آفس چلو میں تمہارے لیے کوئی جگہ نکال لوں گا۔ اگر تم زیادہ عرصہ یونہی فارغ رہیں تو بالکل پاگل ہو جاؤ گی۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ سپاٹ لمحے میں گویا ہوئی۔

”ارتونج، چلو کسی سایکاٹرست کے پاس چلیں۔“ تیمور نے بے حد محبت بھرے لمحے میں کما تھا مگر وہ بھرک اٹھی۔

”تمہارا خیال ہے کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔“

”آنکھوں میں خفگی اتر آئی۔“
”نہیں تمہیں تسلی دینے کے ٹھیک دو ماہ بعد تمہارا رستہ کوئی سہری باؤں پا کالی آنکھوں والی روک لے گی تو تمہیں ریاب یاد بھی نہیں آئے گی۔ اس لیے ڈرامہ مت کرو۔“ اس نے کپ سائیڈ نیبل پر بیٹھا۔

”تم اتنی سفاک کیوں ہو گئی ہو ارتونج! میں نے رباب سے واقعی محبت کی بھی۔“

”تمہیں ہر لڑکی سے واقعی محبت ہو جاتی ہے اس تیسری سے بھی ہو جائے گی، اس لیے فوراً اٹھ جاؤ۔“ اس کرم شام انہوں نے آنس کریم کھلائی کم پچھلائی زیادہ گئی وہ بات بے بات اسی کا تذکرہ کر رہا تھا۔

وابسی پر جمشید نے وائلن پر اسے کئی خوبصورت دھنیں سنائیں۔ وہ گم سی ہو گئی، لتنا عرصہ ہو گیا۔ اسے وہ خواب دوبارہ نہیں آیا تھا۔ اور وہ وہن اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اس اک احساس ساتھا۔

جمشید کا وائلن خاموش ہو گیا تو وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ اور نجانے کیا سوچ کر اس نے رباب کو فون کیا تھا۔ وہ مسوروں فواد کے پرپوز کے بارے میں بتانے لگی۔

”لیکن ربایپ! تم تو جمشید سے محبت کرتی تھیں۔“
”بال کرتی تھی۔“ وہ بس دی۔ ”وراصل تے

جمشید کہہ رہا تھا کہ اس کے ڈیڈی کے ساتھ اس کی صلح ہونے والی ہے۔ لیکن اب پتا چلا کہ اس کے ڈیڈی اس سے اتنے تک آگئے ہیں کہ ایسے عاق کرنے والے ہیں۔ پھر فواد کا پرپوز آگیا۔ اور تمہیں تو پتا ہے یا اس کی فیکلی کیا چیز ہے اور خود اس کا فیوج کتنا براہت ہے۔ مماکا کا خیال ہے میرے لیے فواد ٹھیک رہے گا۔ وہ امریکہ سے آجائے تباہی میں ہے۔ جوانے بیڈ روم میں حیلہ پکھ اور جلا رہا تھا۔ ارتونج نے روپے شاکر بیڈ روم کے یا سیت زدہ ماحول کو بدلنے کی کوشش کی۔ سی ڈی پلیسیر میں سے روپی دھوکی ہی۔ ڈی نکال کر اس پاسی گرل کا نیا الیم لگا کر وہ ایوم فل کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھ سے مگ پھینٹے ہوئے بولی تھی۔

”چلو جائیں کہم کھانے جائے ہیں۔“ ان ہی سوچوں میں ابھتی وہ گھر پیشی تو ملازم نے بتایا کہ عامر اور مگی فارینہ کو لے کر ہستال گئے ہیں۔

دھن بجائی تو وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دا لے ڈا
فلور کی طرف بڑھ گئے۔ وہ تدریے ہٹ کر صوف پر جا
بیٹھی۔ کسی نے اس کے ہاتھ میں سوف ڈرنک کا
گلاس تھما دیا تھا۔ تب ہی جمیش اس کے پاس آبیٹھا۔
”بائے ارتچ۔“

”بائے جم۔“ اس نے خوش قلی سے مکرانے کی
کوشش کی۔

”یو آر لکنگ سوپریئ۔“ جمیش نے سرتپا اس کا
جاائزہ لیا۔

”خینکس۔“ اس نے خالی گلاس ایک طرف
رکھ کر فارمل سے لمحے میں کھا تھا۔

”تمہیں ریاب کے ساتھ فواد کو دیکھ کر جلسی
فیل نہیں ہوئی۔؟“ ارتچ گرون نے گھما کر ایک
دوسرے میں گمان پوتوں کو دیکھا۔

”سوچ کر ہوتی تھی، دیکھ کر نہیں ہوئی۔“ وہ آہستگی
سے نہ۔

”چھا!“ ارتچ کھلکھلا کر نہیں دی۔
وہ اس کے یوں کھلکھلا اُنھے پردم بخود سا ہو کر
اسے دیکھنے لگا۔

”تیمور یونی تو تمہارے پیچھے پاگل نہیں۔“
”واٹ ڈولو مین۔“ وہ ایک دم سجیدہ ہو گئی۔ تب
جمیش نے آہستگی سے اس کا کال پچھو کر کہا۔

”بہت خوبصورت ہو تم، یوں لگتا ہے، مجھے تم سے
محبت ہو جائے گی۔“

وہ ایک پل کو ساکت ہوئی اور دوسرے پل اس کا
ہاتھ جھٹک کر فلور سے نیچے اتر گئی۔ جم نے اسے پکارا
مگر وہ بھاگتی ہوئی یونی دروانہ کر اس کر گئی۔

اسے جمیش سے ایک دم شدید کراہیت کا احساس
ہوا تھا۔ اسے شدید روٹا آرہا تھا اور گاڑی میں بیٹھ کر
خوب سریعی بھی تھی۔

یہ بیسی محبت بھی جو بھی لیتا سے ہو جاتی ہے۔ بھی
کھر میں رہتی ہے تو اسے اس کا حق مل کر رہے گا۔“
ریاب سے تو بھی ارتچ سے بیس نہیں تو وہ سی وہ نہیں
مما کا لجھ سخت اور بے چک تھا، اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ
تو کوئی اور۔“

”سب ایک جیسے ہیں۔ سب ایک جیسے۔ کسی کو
افذ نہیں کہا جائی تھی۔ اگر می جائیداد میں سے کچھ حصہ

کسی کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب
وقت گزاری کے مشغلوں ہیں۔ خود غرضی کے
رشتے جھوٹ، فریب، ڈھکو سلے میں کیسے کسی
اعتبار کروں، کیسے؟“ وہ اسیٹر نگ پر ہاتھ مار مار کر روئی
رہی۔

”بیٹھ کر غصہ آئے لگا تھا۔ اس
میں جانتی ہوں کہ مجھے اس کے لیے کیا کرنا ہے۔“

”دشی ازناٹ یورڈ اڑ می! (وہ آپ کی بیٹھی نہیں ہے)
اور میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ اپنی سکی اوولاد کے
 مقابلے میں آپ ایک لے پالک کو ترجیح کیوں دے
رہی ہیں؟“

”رشت اپ فارینہ۔“ می خیخ اٹھی تھیں۔ اور باہر
کھڑی ارتچ گویا، وہ پورے قد کے ساتھ نہیں پر
اگری ہے۔

لے پیغامی کی بے پیغامی تھی، وہ گویا عرش سے فرش پر
آپڑی تھی۔ زندگی کے اتنے برس وہ جس نام کو اپنے نام
کے ساتھ اپنی شاخت کی بیگمیل کے لیے استعمال کرتی
رہی۔ وہ اس کا نہیں تھا۔ وہ کیا کھی؟
ماشہ صالح الدین کی بیٹھی۔

شادی کے سات برس کزر جانے کے بعد اولاد نہ
ہوئی تو مسز فرزانہ عثمان نے اسے گوولیا تھا۔ اور اسے
شنزادیوں کی طرح پروان چڑھایا۔ سیٹھ عثمان لڑکا گولیدا
نہیں چاہتے تھے، ایک لے پالک ان کی پوری جائیداد کا
وارث ہوئی۔ اسیں گوارانہ تھا۔ سو انہوں نے ارتچ کو
گوولے لیا۔ مخف اپنی چیتی بیوی فرزانہ کی ضد پر جو
اس بیچ کو گودو کی گرمی تو نہ دے سکیں مگر اس بیچی نے ان
کے کھر کا سونا پن ضرور بانٹ لیا۔ مگر یہ کسی کے لیے
حی کہ ارتچ کے لیے بھی اچھنے کی بات نہ تھی کہ پہا
اس پر توجہ کیوں نہیں دیتے۔ یا می اسے اپنے سینے
سے یوں نہیں لگاتیں کہ اس نے اپنے گرد موجود ہر
بیچ کو گورنیس کی گمراہی میں ہی پروان چڑھتے دیکھا تھا۔
اسے بھی نہیں لگا کہ وہ اس کی فہمی نہیں ہیں۔

انہوں نے اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا تھا۔ اور
کہ ہاتھ پر رکھ کر اچانک پوچھا تھا۔

”بیٹھ کر غصہ آئے لگا تھا۔ اس کے لیے کیا کرنا ہے۔“

جب خدا نے خود انہیں بیٹھی کی نعمت سے نوازات بھی
انہوں نے ارتچ کو کوئی کمی نہ آئے دی تھی۔ بیس اس
کا انہا مژا ج ہی پکھ اور تھا وہ ہر کسی سے دور ہو گئی تھی۔
ہر جیز سے بیزار، اس نے سب سے مانا چھوڑ رکھا تھا اور
یہ باتات تو طے تھی کہ وہ جب بھی پریشان ہوتی وہ خواب
متسلسل و متواتر اس کی بے چین نیزد میں دستک دیتا
تھا۔ مگر اب اسے اس تسلسل پر غصہ آئے لگا تھا۔ اس
فرانسیسی طرز کے درستھے پر، اس پر جھکی سفید پھولوں
سے لدی بیل پر، وائلن گی دھن پر، اسے سنبھال لینے
والے شخص تھے بعد میں نے اسے دیکھا تو مفعلاً کسی
تین دن کے بعد میں نے اسے دیکھا تو مفعلاً کسی
گئی۔

”ہذا خوداں کے کمرے میں آئی تھی۔
”ارتچ! کیا ہوا؟“ اتنا زرد چڑھو، وہ حیران کی
ہو گئی۔

”می ابھی آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔“
”یہاں آؤ میرے پاس، پہلے بتاؤ، تمہیں ہو آکیا ہے،
یہاں ہو۔“

پچھلے دو دن وہ اتنی مصروف رہی تھیں کہ گھر میں
جھانکنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا وہ ان کے قریب آئی اور
مخفتوں کے بل ان کے قریب بیٹھ گئی۔ می کی گود میں
کچھ فالمیں دھری تھیں۔ انہوں نے یونہی آگے
چک کر اس کا چھرو اپنے ہاتھوں میں لیا۔
”ارتچ تم ٹھیک تو ہو۔“

”ٹھیک ہوں می! مجھے کیا ہوا ہے۔“ اس کی
مکراہست پھیکی سی بھی۔ می نے ہاتھ ہٹالیے۔ اور گود
میں پڑی فائل اس کے سامنے کی۔

”ارتچ! میں نے ڈینفس والی کو بھی اور اسلام آباد
والا بیتلہ تمہارے نام کیا ہے بینک میں تمہارے نام کا
اکاؤنٹ ہے جس میں۔“

”می!“ اس کے بول اٹھنے پر وہ خاموش ہو کر اسے
دیکھنے لگیں۔

”می! میں کس کی بیٹی ہوں؟“ اس نے اپنا ہاتھ ان
کے ہاتھ پر رکھ کر اچانک پوچھا تھا۔

می ششد رہ گئیں۔

”می! مجھے بتائیں، انہوں نے مجھے آپ کو کیوں دے دیا۔“ ”ارنج! تم میری بیٹی ہو۔“ می کی آواز مدھم سی تھی۔

”می۔“ وہ مضھل سی مسکراتی۔ ”فیکٹ از فیکٹ، مجھے بتائیں ماشر صلاح الدین کوئی ہیں؟ کمال ہیں، پلیز می۔“ وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی۔ می نے ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کیں۔ انہیں لگا اب ارنج سے چھپانا ناممکن ہے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ منتظر تھی۔

”میرا لعاق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ اتفاقاً“ شادی سینھ عثمان سے ہو گئی۔ ماشر صلاح الدین میرے دور پرے کے کزن تھے۔

♥ ♥ ♥

وہ گھر سے نکلی تو کالی کالی بد لیاں پچھتم سے اٹھی تھیں اور اب چھابجوں چھاج برستا مینہاں اس کے رستے میں حائل تھا۔ نیچے اس کی گاڑی کے گرو بارش میں انھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے، کچھ دور آم والا ریڑھی پر، پیلے سر ز آم سجائے دھوتی اور بنیان میں مبسوں بارش میں بھیتا ہوا اوپھی آواز میں گاہرا تھا۔
بھاگاں والیو، آم

مولا آم
آم کھاؤ آم۔

سامنے والوں کی بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا اور ایک نوجوان صوف فرٹا نہیں بچھائے خاموشی سے برسے ساون کا لطف لے رہا تھا۔ اس کے ڈیک پر فل آواز میں گانے چل رہے تھے۔ تب ہی اک نوجوان ہاف جینز اور ٹی شرٹ میں گاتا ہوا گزرنا۔

”ساون بر سے تر سے دل۔“

ارنج نے بارن بجا کر انی طرف متوجہ کیا تو جہاں وہ بیٹھک کر رکا وہیں بیٹھک واپسے لڑکے نے گرون موڑ کر اس کی طرف دیکھا، آم والا بھی گناہ جوں کراس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ماشر صاحب کا گھر کون سا ہے۔؟“ ”ماشر صاحب۔“ نوجوان نے قدرے تعجب سے گاڑی میں بیٹھی لڑکی کا حلیہ ملاحظہ کیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ”فلی میں نیسم والا گھر انہی کا ہے۔“ ”محظیں یو۔“

ارنج نے گرون گھما کر گلی میں دیکھا۔ پختہ کلی کشاہہ تھی۔ وہ گاڑی اندر لے گئی۔ نیم کے درخت کے نیچے لوپے کی کری بھیگ رہی تھی۔ ”گاڑی سے نکل گر رہا تھا؟“ ہوئی نیم کے درخت کے نیچے آگئی۔ سبز پتوں کو چھو کر شاخوں میں سے رستہ بنائی بارش کی بوندیں اسے بھگونے لگیں۔ اس نے لب کاٹتے، تھیسا یاں مسلتے ہوئے پلت کر نیلے دروازے کو دیکھا۔

اس کا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔ بند دروازے کے پیچے اس کے لیے نجات کیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکا۔ عجیب ساڑہ اور خوف، عجیب کی بھبھ کیا۔ ”اگر انہوں نے مجھے تسلیم ہی نہ کیا۔“ اسے لگا اگر ایسا کچھ ہوا تو وہ واپس نہ جلاپائے گی۔ اس کا وجود یہیں بکھر جائے گا۔ اس کی ہتھیں نہ بہت ڈرتے ڈرتے دستک دی۔ دوسری طرف پختہ صحن پر گرتی بارش کی آواز کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

اس نے بے تاب ہو کر دروازہ دھڑ دھڑایا۔ دوسری طرف قدموں کی چاپ ابھری۔ کسی نیچے نہ بے عجلت دروازہ کھولا۔

”اندر آجائیں۔“ وہ اسی عجلت میں کہہ کر بھاگ جانے کو مڑا، پھر ایک دم بیٹھک کر رک گیا۔ سرتپا اس کا جائزہ لیا۔

”ماشر صاحب ہیں۔؟“ ”ہیں، اندر آجائیں۔“ اس نے تہذیب سے جواب دیا۔

وہ اندر چلی آئی، پختہ کھلے سے صحن میں ایک طرف جامن کا برد اور خت پھیلا تھا۔ اس کے سبز پتے ہوا کی

لیا۔ اتنے سارے لگ اس کے اپنے تھے اور اس نے

اک عمر تھائی کا زہر پا تھا۔

”یعنی یونیورسٹی میں ہو گی۔ بارش کی وجہ سے لیٹ

ہو گئی ہے۔ ارمغان بھی ابھی تک نہیں آیا شاید یعنی کو

لینے چلا گیا ہو۔ نور صبح ماموں کے ہاں کئی ہے۔ کل

آئے گی۔“

”ارمغان!“ وہ سب کچھ ہی جان لیتا چاہتی تھی۔

”ہمارا اکلوتا بھائی۔“ خوش بخت نے روائی میں

پتایا، پھر چھٹک کر یوں۔

”تمہارا جمی۔“

”یہ یعنی کے کڑے ہیں۔ تمہارے پورے ہوں

گے، کوئی نکال لو۔“ انہوں نے اس کی چواں پر

چھوڑا گمراہ فوراً بول اٹھی۔

”کوئی سا بھی نکال دیں آپ۔“

خوش بخت نے لائٹ پنک میرون ایمیر ایڈری والا

کائن کا سوت نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ تب ہی

نوی بھاگتا ہوا آیا۔

”امی! آپ کو بیبا بلار ہے ہیں۔“ اس نے چونک کر

خوش بخت کو دیکھا۔

”یہ میرا بیٹا ہے نوی۔“

”آپ کی شادی ہو گئی ہے۔“ اس نے بے حد

حیرت سے نازک اور کامنی سی خوش بخت کو دیکھا۔

”ظاہر ہے اسی لیے تو یہ میرا بیٹا ہے۔“ انہوں نے

ہستے ہوئے کہا۔ ”چھاتم کڑے بدلو میں بیبا کی بات

سن کر آتی ہوں۔“

ان کے جانے کے بعد وہ کچھ لمبے سوت ہاتھ میں

لیے یونی کھڑی رہی۔

”آئی ایم ساری ممی! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا

کہ میں انہیں نہیں ڈھونڈوں گی مگر میں رہ نہ سکی۔“

وہ زریب بڑھ رہا۔

کڑے بدلو کر بیبا ہر آئی۔ تو بارش ہلکی ہو گئی تھی۔

نوی پتھرے کے پاس کھڑا توتوں سے انہی کی زبان میں

پاتیں کرتے ہوئے بھاگ بھاگ کر جامنیں اکٹھی کر رہا

تھا۔

کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ انہوں نے حکم کر اس کے سر پر بوس دیا تو جیسے اس کی سکیاں ہم سی ہیں۔

یا یانے سراٹھا کر ساکت کھڑی خوش بخت کو دیکھا۔

”خوش بخت بیٹا! بن کوئے جا کر قرآن العین کا کوئی سوت نکال دو۔“ اس کے کپڑے کیلے ہیں۔ بیمار ہو جائے گی۔

”بھی۔“ اس انہوں نے بے حد چونک کر بیبا کو دیکھا۔ انہوں نے سخیدگی سے اشارا کیا تو انہوں نے

آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”چلو گریا۔“

”میرا نام ارتچ ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے بتایا پھر

سوالیہ نظروں سے بیبا کو دیکھا۔

”آئی ہے تمہاری خوش بخت۔“

ارتچے اختیار پلٹ کر ان کی طرف بڑھی۔ پھر

جھک کر رک گئی۔

”میں بہت ترسی ہوں ان رشتتوں کو۔ آئی۔“

خوش بخت نے مکر اکارے گلے سے لگایا۔ پھر

ساتھ لے کر ایک کرے میں چل گئیں۔ کمرے میں

ڈبل بیٹھ رانٹنگ نیبل اور وارڈروب ہی۔ رانٹنگ

نیبل پر کتابوں کے ساتھ چھوٹا شیپ ریکارڈر اور بہت

سی کیٹیس پڑی تھیں۔

”یہ یعنی اور نور کا کروہے۔“

”یعنی اور نور؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں

دیکھا۔

”تمہاری بہنیں یعنی تو تمہاری ہم عمر ہی ہو گی۔ نور

البتہ چھوٹی ہے۔“

”ہم عمر کیا مطلب ہے؟ یا تو وہ مجھ سے چھوٹی ہو گی یا

بڑی۔“ ارتچ نے چونک کر پوچھا۔

”ایک آدھہ سال کی چھوٹائی بڑائی کیا۔“ انہوں نے

مکراتے ہوئے وارڈروب کھولی۔

”یعنی انگلش میں ماشرز کر رہی ہے، نور میڑک کے

ایگزام کے بعد فارغ ہے۔“

”کمال ہیں دوتوں؟“ اسے منزدہ بے تابی نے گیر

ماشر صاحب بری طرح چونکے

”کہہ کرہے دیں۔ آپ ہی ہیں۔“

انہیں لگا انہوں نے اگر انکار کیا تو وہ لڑکی مر جائے گی۔

انہوں نے اثبات میں سرہلا دیا۔

ارتچ دو قدم آگے بڑھی۔ انہوں نے کچھ پوچھنا

چاہا۔ مگر وہ ضبط کا بندھن کو بیٹھی۔ گھٹنوں کے بل

بیٹھ کر اس نے ان کا جھریلوں زدہ ہاتھ تھاما اور اس پر اپنی

پیشانی لٹک کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”کیوں کیا آپ نے ایسا بیا؟ کیوں کیا؟ میرا وجود اتنا

برا بوجھ تھا آپ کے لیے؟ لکھی آسمانی سے مجھے

دو سروں کی جھوٹی میں ڈال دیا۔ کہتے ہیں بیٹھ رحمت

ہوتی ہے، آپ نے کیوں اس رحمت کو تھکرا دیا۔ پیالا۔

اور پھر مژہ کر خبیر بھی نہیں۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ بھی کس

حال میں ہے۔

”کون کون ہو تم؟“ وہ گزبرہ سے گئے۔

”میں۔“ اس نے بھگا ہوا چھوڑا اور اٹھا۔ ”میں

آپ کی بیٹی ہوں بیالا۔ وہ بیٹی جسے بیکم عنان کی جھوٹی

میں ڈال کر آپ بھول گئے تھے۔“ ماشر صاحب

ششدہ رے رہ گئے۔

”تم۔“

”آپ مجھے اب بھی نہ ملتے تو میں مر جاتی بیالا! آپ کو

نہیں پتا میں نے کسے زندگی گزاری ہے۔ میں ان

قبوں کے درمیان اجھی تھی۔ میں ان میں سے نہیں

تھی بیالا۔“

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روری تھی اور اس

کے عقب میں کھڑی خوش بخت دم بخود کھڑی تھیں۔

ابھی ابھی نوی نے اگر بتایا تھا کہ کوئی پینٹ والی لڑکی بیالا

سے ملنے آئی ہے۔ وہ کڑا چڑھائے بیٹھی تھیں۔ پچھے

جیران سی ہو کر وہ سب چھوڑ چھاڑ کر آئی تھیں اور اب

دم بخود کھڑی تھیں۔

”کیا یہی ہے بیٹی؟“

”آپ۔ آپ ماہر صلاح الدین ہیں۔“ اس نے

بیٹی کو گلے سے نہیں لگائیں گے میں بہت ترسی ہوں

بیالا! وہ لوگ بہت اچھے تھے مگر میرے نہیں تھے۔“ بیالا

تل پر محور قص تھے پسکی ہوئی جامنیں بیچے گر رہی تھیں۔ ورخت کے بیچے بڑا سارپندوں کا پنجھوڑا تھا،

جس میں کئی رنگ کے بیچے منے آسٹریلین طوطے پر

پھیلائے اور ہر سے اوہ اڑاٹتے ماحول کی خوبصورتی اور

رینگین میں اضافہ کر رہے تھے، چانپیز ڈو محور قص

تھی۔ برآمدوں کا سرخ فرش بھیگ کر پچھے اور سرخ

چاہا تھا۔ ستون کے ساتھ پیٹی سبز نیل سے آٹھی گلابی

پھول ٹوٹ ٹوٹ کر بارش کے پانی میں رنگ گھول رہے

چھوٹے ٹھیکے پسکھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

پوڑے ماحول کو تزوہ تازہ کر رہے تھے، فضائیں بارش کی

خوبیوں کے ساتھ پکوان تلنے کی خوبیوں پھیلی تھی۔

وہ بچہ سامنے والے کروں میں غائب ہو گیا تھا۔

ارتچ نے قدم اٹھائے، تب ہی نگاہ داں میں طرف

قدھرے الگ تھلک بنے کروں کی طرف اٹھ گئی۔

چھاں گاؤں تکیے سے نیک لگائے باریش بزرگ صورت

فخش محوم مطالعہ تھا، اس کی پوری توجہ ہاتھ میں پکڑی

کتب پر مبنی ہے تھی۔

ارتچ کا اول دھڑک دھڑک کر بے تاب و بے کل

ہو رہا تھا۔

”کیا یہی ہے؟“

اس کے قدم بے تاب و بے کل دروازے سے روشنی آتا معدوم ہوئی تو ماشر

صاحب نے چونک کر سراٹھا۔ جینز اور شرت میں

بلیوس اجنبی لڑکی کو دیکھ کر چونک کر سیدھے ہوئے۔

”کس سے ملنا ہے بیٹی؟“ ان کے ذہن میں پہلا

خال یہی آیا کہ شاید کوئی قرآن العین کی یونیورسٹی قیلو ہو گی۔ مگر وہ تو ابھی یونیورسٹی سے اولی ہی نہ تھی۔

وہ اپنی بیٹی کا گاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

ماشر صاحب کو الجھن سی ہوئے لگی تھی۔

”کیا یہی ہے بیٹی؟“

”آپ۔ آپ ماہر صلاح الدین ہیں۔“ اس نے

بیٹی کو گلے سے نہیں لگائیں گے میں بہت ترسی ہوں

بیالا! وہ لوگ بہت اچھے تھے مگر میرے نہیں تھے۔“ بیالا

کے جھریلوں زورہ چڑھتے کاٹاٹواف کر رہی تھیں۔

”بیالا!“ چپ کیوں ہیں۔ بولیے تا۔ کیا اب بھی اپنی

انک انک کر پوچھا۔ اس کی نگاہیں تریں کر ان

کے جھریلوں زورہ چڑھتے کاٹاٹواف کر رہی تھیں۔

اسے بجے سجائے نہیں تاریک بیڈ روم کی سرد تنالی
یاد آگئی۔ تو وہ ستون کے پاس رک کر نومی کو دیکھنے لگی۔
بارش میں پورے کاپورا بھیگا۔ خوش اور مکن وہ یہاں
ہوتی تو اس کا بچپن بھی اتنا ہی خوبصورت اور بے فکر
ہوتا۔ اسے اپنی بارش میں بھیجنے کی حضرت یاد آگئی اور
مالی کی یہوی کے پاس اس کے پچوں میں ٹھہر کر
پکوڑے کھاتا۔ وہ مسکرا دی تب ہی پکوڑوں کی خوبصورت
نے اس کی رہنمائی کی تو وہ سائیڈ پر بنے پکن کی طرف
بڑھی چھوٹا سا صاف سترھا پکن تھا۔ خوش بخت آپی
پکوڑے کڑا ہی سے نکالنا بھول گئی تھیں۔

”آپی۔“ ارتیج نے پکارا تو وہ چونک گئیں۔

”پکوڑے سارے جل گئے۔“

”وہسے۔“ وہ کچھ خفیف سی ہو کر پکوڑے نکلنے
لگیں۔

”کیا سوچ رہی تھیں؟“ ارتیج ان کے پاس بیٹھی۔

”کچھ خاص نہیں۔“

”آپ کو میرا یہاں آنا برا تو نہیں لگا۔“ اک بیکاسا
خوف تھا۔

”لگا! برا کیوں لگے گا، لو پکوڑے کھاؤ۔“ انہوں
نے پہلے نکالے گئے پکوڑے اس کے سامنے رکھے۔

”بلبا۔!“
”وہ ظہر کی نماز پڑھنے گئے ہیں۔“ خوش بخت نے
ہتایا تو وہ خاموش ہو کر نجائزیا سوچتے گئی۔ خوش
بخت نے چولہابند کیا اور فرنچ سے وہی نکال کر رانیتے
کے لیے چھینٹنے لگی۔

”آپی! آپ کو پتا تھا کہ آپ کی کوئی اور بہن بھی
ہے۔“ اس نے اچانک سوال کیا۔ خوش بخت کا ہاتھ
نے کھا اور آگے بڑھے آگئی۔ ارمغان موڑ سائیل کھڑی
ایک پل کو ھم گیا۔

”ہا۔“
”وہمارا مجھے پہلے ہی پتا تھا“ ارمغان نے نعروگا کیا۔

”اپ آج تو بخوب کبھی زوروں کی لگی ہے۔“ عینی
نے کھا اور آگے بڑھے آگئی۔ ارمغان موڑ سائیل کھڑی
کرنے لگا۔ عینی اجنبی صورت دیکھ کر نہیں بھیکی۔

”ارمغان! عینی! لور نور!“ اس نے اگلا سوال
کیا۔ خوش بخت نے ایک نظر اس کے خوبصورت
چہرے پر ڈالی۔ پیسے تھا شارو سنوے اس کی آنکھیں
ہو رہیں۔ تب ہی ارمغان سر کے بال جھلتا ہوا
سرخی ہو رہی تھیں۔

”نہیں۔“ اور وہیں نہیں بھیکی۔

”آپی۔“ پاشیں تو ہوتی رہیں گی ارتیج۔ خوش بخت
زی سے اس کی بات قطع کی۔
”ابھی وہ لوگ آتے ہوں گے۔ چلو برآمدے میں
میز لگاویں۔ وہیں بیٹھ کر کھائیں گے۔ مزا آئے گا۔“
تب ہی نومی بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں
جامنوں سے بھری پلیٹ تھی۔
”می! دیکھیں میں نے لتنی ساری جامنیں اکٹھی
کر لیں۔“

”اچھا۔ انہیں دھو کر نیبل پر رکھو، ماموں اور خال
آتے ہی ہوں گے۔“ خوش بخت نے کما تو وہ سنک کی
طرف بڑھ گیا۔ پلیٹ ایک طرف رکھی، کن اکھیں
سے ارتیج کو دیکھتے ہوئے مال کے کندھے پر جھکا۔

”ای! بیوی کون ہیں۔“
”یہ بھی تمہاری خالہ ہیں۔“ خوش بخت نے بتایا
ارتیج نے مسکرا کر اس کی سمت دیکھا۔
”کون کی کلاس میں پڑھتے ہو نومی۔۔۔؟“
”کلاس تحری۔“

”یہاں میرے پاس آؤ۔“ ارتیج نے پکارا تو وہ
چھوٹی ہوا اس کے پاس آگیا۔ ارتیج اس سے چھوٹی
چھوٹی پاتیں کرنے لگیں اور ہوشیار بچہ تھا۔
خوش بخت نے پکوڑے جامنیں رائستہ اور اہلی کی
چشمی برآمدے میں نیبل پر رکھ دی۔ ابھی وہ لوگ بیٹھ
تھی تھے کہ ارمغان اور عینی آگئے۔ بارش رک ٹھی
کی۔

”وہمارا مجھے پہلے ہی پتا تھا“ ارمغان نے نعروگا کیا۔
”اپ آج تو بخوب کبھی زوروں کی لگی ہے۔“ عینی
نے کھا اور آگے بڑھے آگئی۔ ارمغان موڑ سائیل کھڑی
کرنے لگا۔ عینی اجنبی صورت دیکھ کر نہیں بھیکی۔
کیا۔ خوش بخت نے ایک نظر اس کے خوبصورت
چہرے پر ڈالی۔ پیسے تھا شارو سنوے اس کی آنکھیں
ہو رہیں۔ تب ہی ارمغان سر کے بال جھلتا ہوا
سرخی ہو رہی تھیں۔

”نہیں۔“ اور وہیں نہیں بھیکی۔

”کیا یہ میرا تخيیل ہے؟“
”آپ۔“ وہ ہر بیل خوبی کی طرح اس کے ساتھ
ہوتی تھی جسے ہر بستی بارش میں اسی ریستوران اور
فلاؤر شاپ پر ڈھونڈا کرتا تھا۔ وہی جس کے نام اس
نے اپنی ہر شام لکھی تھی۔
وہی جس کی خاطر اس نے اپنی زیست کے ہر لمحے کو
سبنجال رکھا تھا۔
اوہھے کلب کا گلب کی کمالی۔
غالص لمحوں جیسی انمول لڑکی۔
یہ خواب تھا یا مگان
یہ سراب تھا یا حقیقت
”اڑے تم۔“ ارتیج کو خشکواری حیرت ہوئی۔
خوش بخت نے ان دونوں کو دیکھا۔

”ارمغان یہی ارتیج ہے۔“ ہماری بہن۔
ارمغان کو لوگا ہزاروں بھر ہیں جو اس کے وجود کے
اندر بھٹے تھے۔ اس نے وہیں گھر، اپنے وجود کو رینہ
رینہ ہو کر بکھرتے دیکھا۔

♥ ♥ ♥
کسی نے حال پوچھا تھا ہمارا
کسی کی آخری لب جارہی ہو
کوئی اشآپ پر تناکھڑا ہو
مسلسل رات کھری ہو رہی ہو۔
ہمارا حال ایسا ہے سمجھو لو
کسی کو کوئی شے بھائی ہی نہ ہو
کسی کا کوئی بھی اپنا نہ ہو
کسی کا کوئی بھی ساتھی نہ ہو
ہمارا حال ایسا ہو گیا ہے
کہ جیسے اپناسب سمجھو گیا ہے
قلافتہ ناؤڑوںی جارہی ہے
شمیں ابھر ابھنور میں ہو گیا ہے
بھنور کو جب کوئی ساحل سمجھے
کوئی مشکل کوئی منزل سمجھے
وہی اپنا حال مل سمجھے

ہمارا حال ایسا ہے سمجھو لو
نجائی میں کہاں گھر ہوں۔
شاید زین کے آخری کنارے ہے ہیں مگر اپنے ذلتے
میرے قدم کو لکھ رہا ہے ہیں مگر اپنے ذلتے
وجود کو سنبھالنے کے لیے سورج نہیں تھام سکتا۔
سورج جو میرے اتنا قریب ہے کہ میں پھل کر
اپنے ہی قدموں میں آپ رہا ہوں۔ ابھی پچھے بھلے بھجے
میرے ہونے کا احساس تھا۔
میں وہیں کھڑا تھا، اپنے دھیان کی سڑک پر فلاؤر
شاپ کے سامنے بستی باریں میں بھیکھتا ہوا۔
بارش جو خوبیوں ساتی تھی۔
بستے سے پھولوں میں اک ادھ کھلا گلب
میری معصوم پاکیزہ محبت کی علامت
مگر وہ اکیا؟
آسمان کی کوکھ بخیر ہو گئی۔
اڈھ کھلا گلب، میرے ہی قدموں تلے آکر رو ندا
گیا۔
میں نے پانی آنکھوں سے اس فلاؤر شاپ کو بھر بھر
حلتے دیکھا۔ کیونکہ آج میں نے اسے تیری بارا پنے
گھر میں دیکھا۔
اور کس روپ میں دیکھا۔
ایک پل کو میرا دل چالا میں خود کشی کر لوں۔
مگر میں اب بھی زندہ ہوں۔

وہ بے حد خوش تھی۔ اسے لگانیں و آسمان اس کی
دسترس میں آگئے ہیں۔ اس نے پہلی بار خوشی، غالص
خوشی کے انساں کو چھو کر حسوس کیا تھا، وہ وہاں سے
کبھی واپس نہ آئی مگر بیانے کہا۔ وہ رات یہاں رک
گئی تو میں پریشان ہوں گی۔
وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں پریشان نہیں ہوتی۔
انہیں تو خبر بھی نہ ہو گی کہ ارتیج گھر لوں تھی یا نہیں۔ مگر
وہ خاموش ہو کر لوٹ آئی تھی۔ ساری رات مارے
خوشی کے اسے نیندہ آئی۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ ایک
ایک کو پکڑ کر بیانے کے اسے اپنے مل کئے

ہیں۔ اب اگر وہ ہمارے بے دخل بھی کروی جائے تو وہ اکلی نہیں ہوگی۔ بہت سے لوگ ہوں اسے سارا دینے کو۔ اس کے اپنے لوگ اس کا باپ اس کی بہنیں، اس کا بھائی، حالانکہ ارمغان کارویہ خاصاً حوصلہ شکن تھا جب کہ وہ خود خوشی سے اچھل ہی تو پڑی تھی جب اس نے ارمغان کو وہاں دیکھا۔ مگر وہ غافلی باندھے اسے دیکھا۔

اور جب خوش بخت آپی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو۔؟“

”بہن۔“ اس نے آپی کا سوال گویا۔

”بچپن میں یادیں اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دے دیا تھا۔“ انہوں نے بے حد آسٹنگی سے بتایا۔ تو چہاں یعنی نہ باتھ میں پکڑی پلیٹ واپس نیبل پر رکھی تھی وہیں وہ ایک دم مردا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہر نکل گیا۔

اس نے گھبرا کر خوش بخت کی سمت دیکھا۔

”اچانک انشاف ہوا ہے تا، بعد میں آئے گا تو تم سے ٹھیک طرح سے ملے گا۔ تم لویس۔“ انہوں نے

بات بدل دی تھی۔ مگر وہ شام ڈھلنے تک نہیں لوٹا تھا۔ بعد میں بیبا بھی آگئے یعنی اچھی خوش مزاج لڑکی تھی۔

ارتھ کو لگا اس کی یعنی کے ساتھ دستی ہو جائے گی۔ نور سے ابھی وہ ملی نہیں تھی اور ارمغان۔

”دوستوں کی طرف نکل گیا ہو گا۔“ اس کے پوچھنے پر بیبا نے اطمینان سے جواب دیا۔

♥ ♥ ♥

اگلی صبح اس نے اپناوارڈ روپ کھولا۔ اس کے پاس چند ہی شلوار سوت تھے اس نے گرے سوت نکال کر ”بیمار ہو گئے۔“ وہ اس کے قریب آئی اور دوسرے پل پہن لیا۔ پاؤں کو سمیث کر گلپ کیا اور بنا میک اپ اس کا ہاتھ ارمغان کی پیشانی پر تھا۔ ارمغان کو لگا اس کی پیشانی پر جلتے ہوئے انگارے کے نکلی آئی۔ جہاں وہ چارہ ہی تھی وہاں ان مصنوعی اپرے ہیں۔ اس نے ارتھ کی کلامی کو جھنکا دے کر لوازماتی ضرورت نہ تھی۔

دوانہ خوش بخت نے کھولا تھا، اسے دیکھ کر باتھ ہٹایا اور تیزی سے کروٹ بدلتی۔

مکراویں۔ ”بیبا کو یقین تھا کہ تم صحی ہی آجاوگی۔ اور وہ بھی ہنا شاشتے کیے۔“ ”چھا۔“ وہ نہ دی پھر بیٹھ کے بندروازے کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ”کہاں ہیں بیبا؟“ ”سکول گئے ہیں۔ حالانکہ جب سے ارمغان کی حباب ہوئی ہے، وہ یہی کہتا ہے کہ رٹائرمنٹ لے لیں۔ مگر بیبا بھندیں کہ بُل از وقت رٹائرمنٹ نہیں لیں گے۔

”عینی اور نومی۔؟“ ”چلے گئے پونیورٹی اور اسکول۔“ وہ اسے لے کر پکن میں چلی آئیں۔

”کیا لوگی تم ناشتے میں۔ پرانھا یا ڈبل روٹی؟“

انہوں نے فرنچ کھولتے ہوئے پوچھا۔ ”کچھ بھی دے دیں۔ پرانھا بنادیں۔“ اس نے فرماں کی انہوں نے فرنچ سے آٹانکال کر بیا ہر رکھا۔

”پہلے میں ارمغان کو دیکھ دے آؤ۔“ انہوں نے ایک پیالے میں دلیہ نکلتے ہوئے کھاتوہ چونک گئی۔

”ارمغان گھر پر ہے؟“ ”ہا۔ اسے بخار ہے۔“ خوش بخت نے بتایا پھر

قدرے جھنجلا کر بولیں۔ ”یک دم احمق ہے۔ کل ساری رات بارش میں بھیلتا رہا۔“

”میں بھی اسے دیکھ لول۔“ ارتھ کو قدرے پریشان ہی ہو کر ان کے ساتھ ارمغان کے کمرے میں آئی وہ آنکھیں مووندے لینا تھا۔ آہٹر آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا۔ ارتھ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی سرخی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

”کیسے ہو ارمغان۔؟“ اس نے مکرا کر پوچھا۔

”بیمار ہو گئے۔“ وہ اس کے قریب آئی اور دوسرے پل اس کا ہاتھ ارمغان کی پیشانی پر تھا۔

ارمغان کو لگا اس کی پیشانی پر جلتے ہوئے انگارے کے نکلی آئی۔ جہاں وہ چارہ ہی تھی وہاں ان مصنوعی اپرے ہیں۔ اس نے ارتھ کی کلامی کو جھنکا دے کر لوازماتی ضرورت نہ تھی۔

دوانہ خوش بخت نے کھولا تھا، اسے دیکھ کر باتھ ہٹایا اور تیزی سے کروٹ بدلتی۔

”اگر مغان کو میرا ہماب آنا اچھا نہیں لگتا نا۔؟“ ”خوش بخت نے نیلی آنکھوں کی صاف سطح پر غم کی لکیریں دیکھیں۔ ”پاکل! اچھا کیوں نہیں لگے گا۔ لیکن میں نے تمہیں بتایا نا، بیماری میں وہ یونی بد مزاج ہو جاتا ہے۔ اگر بیبا کو پاچلا تو رکھنا کیسے کان کیچھیں گے۔“ ”ارے نہیں آپی! بیبا کو مت بتائے گا۔ اس طرح تو وہ مجھ سے اور بھی چڑھ جائے گا۔“ وہ فوراً ”بول“ اسی تو خوش بخت پڑیں۔ ”آپ کی نہیں بہت خوبصورت ہے آپی۔“ ”خوبصورتی کا لفظ تو تم پر ختم ہو میا ہے میری جان۔“ خوش بخت نے اس کی ٹھوڑی چھوڑ کر محبت بھرے لجھ میں کھاتوہ جھینپ سی تھی۔ ”یکن اب تم پر اٹھاٹھنڈا کر رہی ہو۔ کہ تو آیت پناوں۔“ ”نہیں آپی! یہ کافی ہے۔ آیت تو میں یوں بھی نہیں کھاتی۔“ ”چھا،“ میں دیکھتی ہوں کہ ارمغان نے دلیہ کھایا یا نہیں اگر میں نہ ہوں تو یہ لڑکا تو بس۔“ ”آپ کا گھر کہاں ہے آپی۔؟“ ”میرا گھر۔“ وہ ایک دم چپ ہوئیں پھر مکرا کر پوچھنے لگیں۔ ”کیوں یہ میرا گھر نہیں ہے؟“ ”میرا مطلب ہے۔“ ”میرے شوہر کا گھر۔“ انہوں نے بات قطع کی۔ ”آپ ہی کا ہوا۔“ ”ہا۔ شایدی۔“ ان کا لجھ عجیب سا ہو گیا۔ پھر لجھ بدلتے ہوئے بولیں۔ ”اسی شریں ہے۔“ ”آپ کتنے دنوں کے لیے آئی ہیں۔“ اسے خوش بخت میں مال جیسی محبت و شفقت محسوس ہوئی تھی۔ ”پتا نہیں۔“ ان کا چھوڑ تاریک سا ہو گیا۔ ”کیا مطلب۔؟“ ”طارق اپنے کام کے سلسلے میں شر سے باہر گئے

ہیں۔ میں بیمل آگئی۔

”آپ کے سرال میں کوئی اور نہیں ہے۔“
”نہیں۔“ وہ جلدی سے کھڑی ہوئی۔ ”میں
ار مخان کو دیکھ لوں۔“

”یوں لگتا ہے، خوش بخت آئی اپنے گھر میں خوش
نہیں ہیں۔“ ارتچ کو یہ سوچ کر ہی دکھ ہوا تھا۔

♥ ♥ ♥
اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ ممی ناشتہ کرنے کے
بجائے مسلسل اسے دلیچہ رہی ہیں اس نے بنا ان کی
طرف دیکھے جائے کامگ لبوں سے لگلیا۔ کچھ لمحوں
کے بعد اسے اب جھن سی محسوس ہونے لگی۔
”کیا ہوا می؟“ کپ واپس رکھ کر اس نے ممی کو
دیکھا۔

”تم صلاح کے گھر گئی تھیں۔“ انہوں نے اچانک
پوچھا تھا۔ ایک پل کوہ کڑبردا گئی پھر گویا تسلیم کرتے
ہوئے بولی تھی۔

”آئی ایم ساری می۔“

”میں نے تمہیں منع کیا تھا۔“ ممی کو غصہ آگیا۔

”میں خود کو روک نہیں سکی۔“

”ارتچ! میری بات غور سے سنوا ب تم وہاں نہیں
جاوے گی۔“ انہوں نے گویا حتمی انداز میں اس پر پابندی
عاہر کی تھی۔ وہ کری گھیٹ کر کھڑی ہو گئی۔
”ارتچ! میری بات کا جواب دو۔“

”آپ کی بات کا گیا جواب دوں می! آپ مجھے ایسے
شخص سے ملنے سے روک رہی ہیں جو میرے فادر
ہیں۔“ ممی کچھ لمجھے اسے دیکھتی رہیں۔

”تیور کب واپس آ رہا ہے؟“

”مجھے کیا معلوم...“

”بیگم زمان اپنے بیٹے کا پروپوزل لے کر آئی ہیں۔“ اس نے بیلا کے پاس بیٹھتے ہوئے نور اور نوی سے پوچھا
میں نے بتایا۔ تو کپ اٹھاتے ہوئے اس نے بیگم زمان کو تو نور قدرے منہ بنا کر بولی۔

”بیلا نے ابھی سے الگش پڑھانا شروع کر دی
اگرنا۔“ بیلا اپنے بیٹے۔

”قارا کاؤ سیک ممی! مجھے اس سے شادی نہیں
کرنا۔“ قارا کاؤ سیک ہے، تمہاری آپی کے آنے کی خوشی میں
چھٹی کر دیتے ہیں۔“

”تیور بھی تم بھی انترست ہے۔“ انہوں نے اگر
پروپوزل پیش کیا۔

”بہت آئی آیم نہات انترست“
”تو پھر تم کس میں انترست ہو؟“ ممی کو شدید تم
کے غصے نے گھیر لیا۔

”مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا ہے۔“ وہ حتمی بچے
پیچے پھینکتا رہا۔ عینی نے مشین بندکی اور فرش دھونے
میں کہ کر انھوں نے۔ ممی شدید غصے میں بڑبردا تی رہ گئی
لگنی تھی تھوڑی دیر میں بیلا انھوں کے

”چچ آپی! میراں چاہتا ہے میں بیہیں آجاوں۔“

”تو آجاو نا۔“ عینی نے مزکر کردا۔ تب ہی ارمغان

اے گھر سے نکل کر ظاہر ہے وہیں آنا تھا، چھٹی کا
پر نظر پڑی تو تھی انھی۔

دن تھا۔ برآمدے میں بیلا بیٹھے اخیار دیکھ رہے تھے
”ار مغان۔“ آگیا کر رہے ہو۔ ساری بیتل کاستیاں اس

کیوں نے واٹنگ مشین لگا کر تھی۔ نور اور نوی

کتابیں کھولے بیٹھے تھے۔ پاس ہی خوش بخت عینی کی
قیص کی کٹائی کر رہی تھیں ارمغان پنجربے کے پاس

کھڑا پرندوں کو وانہ ڈال رہا تھا۔

”آخر پکڑ ہی لیانا میں نے تمہیں۔“ وہ ارمغان کو

دیکھ کر بنس دی۔ جب کہ اس کے پنجربے پر تباہ سا چھا

گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا وانہ ایک ساتھ پنجربے
میں ڈال دیا۔ اس سے بُل کہ وہاں سے چلا جاتا ارتچ

نے اس کا بازو تحمل لیا۔

”نہیں بھالی! اج میں صرف تمہارے لیے آئی
ہوں کہ تم چھٹی کے دن گھر پر ہو گے۔“ وہ بچی بچے

میں گویا ہوئی۔ اس کے وجود سے پھوٹی خوشبو نے

اسے بے چین سا کر دیا۔

”تو پھر آجاؤں بھالی۔“ ارتچ نے دیوار پوچھا۔

ہر یار اک کوڑا سا اس کے وجود پر پڑتا تھا۔

”آپ کی مرضی ہے۔“ اس کا الجھہ ہنوز وہی تھا۔

”خوش بخت آپی۔“ ارتچ نے غصہ میں کھڑے ہو

کر دنوں ہاتھ ارمغان کے کندھوں پر رکھے ارمغان

کو لوگا۔ اک پھاڑ سا بوجھ اس کے دنوں کندھوں پر اگرا
ہے۔ اسے بارے میں سوچات اسے رضا زمان یاد
کرنا۔“ ارمغان مجھ سے چھوٹا ہے پا بڑا۔“

”بڑا ہی ہو گا۔“ خوش بخت کی سمجھ میں نہ آیا کہ
اس پچویشن کو کیسے سمجھا میں۔ ارمغان کو کتنا سمجھایا
ہو کر جانے لگی تھیں۔

”میں کام کرتی تھیں“ عینی نے بے حد حیرت سے
سوال کیا۔

”ہاں، وہ میرے یونیورسٹی قیلو کی شاپ تھی۔ میں
نے یونی جسٹ فار انجوائے منٹ کام کیا تھا تھوڑا
عرصہ۔“

”بڑے عیش تھے تمہارے انجوائے منٹ کے نام
پر کیا کیا کر لیا کرتی تھیں۔“ عینی نے کہا۔

”یعنی کمال یا سے وقت بھی تو کاشنا تھا۔“

ارمغان انھوں کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپی! میں پاسط کی
طرف جا رہا ہوں۔“

”اے ارے بے بھاگے کہاں جا رہے ہو بھالی!“

ارتچ چلائی۔ ”آپی! پہلے ان سے پوچھیں۔ یہ ہر
روز بیال سے پھول کس کے لیے خرید اکرتے تھے۔

”کیا۔؟“ عینی اور نور چیخیں۔ ارمغان نے بیتل کی
شاپ پر چھوڑ آتے تھے۔

”شٹ اپ۔“ ارمغان ایک دم اس کی سوت

گھوہا۔ ”ول یو شٹ اپ پلیز۔“ اس کی آنکھیں سخ

کرنا۔“ قارا کاؤ سیک ممی! مجھے اس سے شادی نہیں

کرنا۔“ قارا کاؤ سیک ہے، تمہاری آپی کے آنے کی خوشی میں
چھٹی کر دیتے ہیں۔“

خوش بخت نے ایک جھٹکے سے سراہٹا کار مغان کو دیکھا پھر ہبکا کھڑی ارتچ کوار مغان کچھ لمحے اپنی سخ نگاہیں س کے چہرے پر گاڑے کھڑا رہا۔ پھر جھٹکے سے مرد تر باہر نکل گیا۔ سب جماں تھے وہیں کھڑے رہ گئے

♥ ♥ ♥
ار مغان کا رویہ اسے اپ سیٹ کر گیا تھا۔
”ایسا کیا کہہ دیا تھا میں نے۔“ اس نے نم آنکھوں سے کئی بار خوش بخت سے سوال کیا تھا۔ وہ خاموشی بس ایسے دیکھ کر رہ گئیں۔ عینی نے کئی بار اسے تسلی دی تھی۔

”یار! وہ ایسا ہی ہے۔ تم طل پر مت لو۔“
”پہلے تو ایسے نہیں تھے۔“ نور نے بھی کئی بار یہی بات کہی تھی۔
”تمہیں ارمغان کے روپے پر پریشان نہیں ہوتا چاہیے۔ یہ بیلا کا گھر ہے اور ہم تمہاری بھیں۔“ خوش بخت نے محکم لمحے میں کہا تھا۔ اور پہاڑے صحرائے چند بوندیں ہی بہت تھیں۔ وہ کب سے آنکھیں موندے یہی سب سوچ رہی تھی۔

”وارتچ! جلدی سے پکڑو، شہنشاہ خار فال سے کا شریت۔“ عینی نے آگر اسے چونکا دیا۔ شریت سے بھرا جک اس کے سامنے نیبل پر رکھ دیا۔
”شریت تو میں پی لوں گی۔ پہلے تم یہ بتاؤ، یہ آزر کون ہے؟“ ارتچ نے پوچھا تو عینی نے چونک کرنے کو دیکھا، وہ پوری دلجمی سے جامنیں کھانے لگی۔
”تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“

”بھی ابھی موصوف کافون آیا تھا۔“ ارتچ نے سمجھیدگی سے جواب دیا۔

”ارے تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ روانی میں بولی۔
”کیونکہ وہ تم سے ملت کرنا نہیں چاہتا تھا۔“ ارتچ ہنورا ایسے بھی میں بولی تھی۔
”کیا مطلب؟“ وہ سرے مل اسے سمجھ دیں آیا کہ فون جوں سب بکواس بے یہ ساری شرارت نور کی پھر

کیونکہ اس نے ارتچ کے سامنے پڑے کارڈ زد کیجھ تھے۔ ”نور کی پنجی۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے لپکی۔ حامنیں چھوڑ چھاڑ بیہر کی طرف بھاگی تھی۔ ارتچ نے مسکراتے ہوئے شریت کا گلاس بیوی سے لگالیا۔ نور کی ٹھیک ٹھاک کھنکائی کر کے ہی اولیٰ تھی۔

”چھایہ تو بتاؤ، شادی کب تک متوقع ہے؟“ اثبات میں سرلا دیا وہ الیم نکال لائیں نور بھی آگئی۔ ”یہ تو آذر کے حالات مخصوص ہے۔“ اس نے اسی زندہ ہوتی تو یقیناً مجھے دیکھ کر بہت خوش شروع کیے۔ چنان کب چالی نور کے ہاتھ لگ پوچھا۔ ”یقیناً۔“ خوش بخت کھوی گئیں۔ مال سے سب زیادہ قریب وہی تو یقین۔

”آذر کی ابھی جاب نہیں ہوئی ارتچ! اور غالباً اسی بالکل آپ جیسی تھیں آپی۔“ اس نے سر اٹھا کر خوش بخت کو دیکھا۔ ہے آذر کی تین بھنیں غیر شادی شدہ ہیں۔ جب تک وہ ان ذمہ داریوں سے عمدہ بر آئیں ہو جاتا شاندیں کر سکتا۔“ ”عمرے لیے تو آپی ہی سب کچھ ہیں، امی تو مجھے یاد ہے اور تم تک کیا کرو گی؟“ ارتچ نے حیرت پا نہیں ڈال دیں تو وہ مسکرا دیں۔

”اور ارمغان بالکل بیلار گیا ہے۔“ ”ظاہر ہے انتظار، جو گزشتہ دو سال سے کر رہا ہے۔“ آپی میں کس پر چلی گئی آپ میں سے تو کسی کی ہوں۔ ”اس نے سب کچھ سمیٹ کر الماری کے خانے میں سنبھال کر رکھ کر لاک کر دیا۔“ میں یونیورسٹی میں اپڈیشن ہی اس لیے لیا ہے کہ مجھے کی شادی کے لیے فورس نہ کر سکے۔“ ”آپ کی آنکھوں کا رنگ عجیب ہے۔ بھی نیلا لٹتا ہے تو بھی سبز۔“

”لیکن عینی! کب تک ارے وہ اگلے پانچ برس تک ان ذمہ داریوں سے۔“

”پانچ برس میں نے تو ساری عمر اس کے نام پر کچھ شرمندی ہو گئی۔“ ”بھی تک گھر نہیں لٹیں ارتچ بیٹا۔“ ”اور آذسے وہ کیا کہتا ہے؟“ ”اس کو کیا کہتا ہے، جب بھی کبھی ملاقات ہے۔“ ”کچھ مسجد سے والپس آئے تھے۔“ اسے وہیں موجود دیکھ دی ہے۔ ”وہ ہو لے سے نہیں۔ ارتچ بس اسے دیکھ نماز کے بعد خوش بخت نے رعلی پکالی، عینی اور نور رہ گئی۔

”اوے آذسے وہ کیا کہتا ہے؟“ ”کیونکہ وہ تم سے ملت کرنا نہیں چاہتا تھا۔“ ارتچ پریشان مجھ پر ہی نکلتے ہیں۔ ”وہ بنتے ہوئے بتارنا پڑیں۔“ ”یہ میرا گھر نہیں ہے بیل۔“ ”یہ میرا گھر نہیں ہے بیل۔؟“ ”اوے سترخوان بچا کر برتن چن دیے۔“ بیلا اور ارمغان کے بھی مسجد سے والپس آئے تھے۔ اسے وہیں موجود دیکھ دی ہے۔ ”لیکن پر ہی ختم ہوتی ہے۔“ موصوف اپنا سامان پڑیں۔ ”جس پر ہی نکلتے ہیں۔“ ”وہ بنتے ہوئے بتارنا پڑیں۔“ ”کیا مطلب؟“ وہ سرے مل اسے سمجھ دیں آیا کہ فون جوں سب بکواس بے یہ ساری شرارت نور کی پھر

”وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی جلدی گھر جلی جلما کرو، مال انتظار کرتی ہوگی۔ بیٹیوں کو یوں شام ڈھلنے کھر سے باہر نہیں رہتا چاہتے۔“ ”بیٹیا! میں میرا بھی انتظار نہیں کرتیں۔“ ارتچ نے لارپوائی سے کھاتو وہ پچھ کرنے کا ارادہ ملتی کرتے ہوئے دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ خوش بخت نے مشرپا اور بیٹایا تھا، وہی کارائست اور سلاو پیاکے لیے روپی اور انڈوں کا سالن تھا۔ اسی آن تھا۔ مخن میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی مگر جامن کے پتوں پر اندر ہیرا پر پھیلائے اونگھ رہا تھا۔ پرندوں کے پنجھے میں بالکل خاموشی تھی۔ ارمغان خاموشی سے نوازے لے رہا تھا۔ جب کہ سب ہی خوش گپیوں اور بلکی پھلکی بالتوں کے ساتھ کھانے میں ملن تھے۔ اسے بول سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا بہت اچھا گا۔ لیکن یہ سارا مزالت کر کر اہواج کھانے کے بعد بیالا نے ارمغان سے کہا کہ وہ ارتچ کو گھر چھوڑ آئے۔ ”کون میں میں...؟“ ارمغان کا ”میں“ خاصا تعجب خیز تھا۔ ”نہیں، میں لے جاتی ہوں بائیک پر۔“ عینی سرگوشی کر کے ہنئے گلی ارمغان نے اسے بڑی طرح گھورا۔ ”ہاں... تم رات ہونے والی ہے۔“ ”وہ حقی انداز میں کہہ کر اٹھ گئے اور سجن کے کونے میں لگے واش بیکن پر جا کر کلی کرنے لگے۔“ ”چلو۔“ ارمغان نے بنا اس کی طرف دیکھ رکھے سے لجھے میں کہا تھا۔ ارتچ کا اٹھنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً ”اٹھنا ردا“ ارمغان نے موڑ سائیکل باہر نکالی تو وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ ارمغان نے بائیک اشارت کی۔ ”سنبھل کر بیٹھو۔“ ارمغان دکھ کی منزل عبور کر کے وہاں کھڑا تھا۔ جمال شدید غصے کی حد شروع ہوتی تھی۔

”دھیان سے چلانا ارمغان! میں کبھی بائیک پر نہیں بیٹھی۔“

ارنج نے حیرت سے اسے دیکھا پھر مسکرا دی۔
”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔؟“

ارمنان نے بائیک چلائی نہیں اڑائی تھی۔ وہ اس کی شرث دلوچے چھپتی رہی کہ آہستہ چلاو مگر اس نے بس گھر کا پتا پوچھا تھا۔ اور گیٹ کے سامنے جب بائیک رکی تو ارج تھا کہ کہا ہوا سانس بحال ہوا۔

”ارمغان! اون سی دشمنی نکال رہے ہو مجھ سے۔ وہ خلی سے گویا ہوئی۔“

”چلتا ہوں اب۔“

”اندر تو آوارمغان۔“ اس نے محبت سے اصرار

کیا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ رکاہی نہیں۔

”پتا نہیں یہ مجھ سے اتنا خفا کیوں ہے؟“

وہ یہی سوچتی ہوئی اندر آئی تولان میں تیمور کو دیکھ کر اس کی طرف آگئی۔ تیمور شاید واپس جانے کے ارادے سے اٹھا تھا۔

”ہائے تیمور!“ اس کی نیکوں آنکھوں میں کسی دیرینہ دوست کے ملنے کی خوشی جنم گئی تھی۔

”تم جلان سے کب لوئے تیمور؟“

”کل رات۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”میں اب واپس جانے ہی والا تھا۔“

”مختیک کاڈ! میں وقت پر آگئی۔“ وہ اس کے سامنے کری پر بیٹھ گئی۔

”سب لوک کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ٹھاک۔“

”فواروالپس چلا گیا۔؟“

”معلوم نہیں، تم کیا لوگے ٹھنڈا ایا۔“

”میں جوں لے چکا ہوں۔“

”تم سارا کام ہو گیا۔؟“

”ہائے تقریباً!“ تیمور نے منظر اجواب دیا اور

لغمیں کیا کہنا تھا رہی تھیں؟“ تیمور نے

سوال پیسرا نظر انداز کر دیا۔ اسے لگتا تھا محبت کی

بغراتے ویکھنے لگا۔

”لیے کیا دیکھ رہے ہو?“ وہ کچھ پڑلی ہو گئی تھی۔ اس کا ظمار تورو یوں سے ہونا۔

”ارج...“ وہ ذرا سا آگے جھکا۔ ”تم بہت خوش“

نے ایر پورٹ سے باہر قدم رکھا تھا۔ سب

ارنج نے حیرت سے اسے دیکھا پھر مسکرا دی۔

”یہ جو تمہارا چھپو ہے ناکھلی کتاب کی طرح کھلی کتاب جس کی گحری ہر کوئی نہیں پڑھ سکتا۔“ تیمور آندھی کے

”اوہ!“ اتنا کافی دل نہیں ہے خود پر۔“

”نہیں ہونا چاہیے۔؟“

”ہاں، تم کہہ سکتے ہو۔“ اس نے آرام

اعتراف کیا۔ تیمور ذرا سا چونک گیا۔

”اس خوشی کا سبب صرف میں تو نہیں ہو،“

اصل وجہ بتانا پسند کریں گی آپ۔“

”تیمور!“ اس نے کچھ لمحے سوچا۔ پھر اس

تیمور سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔

”تیمور!“ تیمور پتا ہے۔ میں سیٹھ عثمان کی نہیں ہوں۔“

”واٹ ڈیلو میں...“ وہ کچھ نہ سمجھنے والے میں اسے دیکھنے لگا۔

ارنج ایک طویل سانس لے کر گھری ہو گئی۔

تیمور بھی اس حقیقت سے سب کی طرح لام تھا۔

”آؤ تیمور! تھوڑی واک کرتے ہیں۔“

تیمور کچھ الجھ کر اس کے ساتھ گیٹ سے باہ

گیا۔ سکوت کا، پیچھی اس اوس سی شام پر

پھیلائے اوٹھ رہا تھا۔ طویل سڑک کے گردیوں پر

کے درختوں کی شاخوں سے خاموشی پیٹی تھی۔

”بہت عرصے سے تمہارا موبائل ہمیں دی

نہیں کرتا۔“

تیمور نے گروں موڑ کر ساتھ چلتی لڑکی کو دی

یہ نہیں جانتی کہ جس لمحے اس نے خالص

خواہش کی تھی۔ وہ سب کچھ گاڑی میں بھول آئا۔

اسے دیکھنے کی چاہے میرے دل کا ہاتھ تھا اسی چاہے کا ہاتھ تھا۔“ تیمور نے

”تیمور!“ میں ممی کی اصلی اولاد نہیں ہوں، انہوں نے مجھے گولیا تھا۔“ ارج نے سمجھدے سے لمحے میں

جواب دیا۔

تیمور کے حلتے قدم ایک دم زنجیر ہو گئے۔ ارج نے

اس کی نگاہوں کی بے یقینی دیکھی اور یوں کلپنس کے تنے سے نیک گاڑ کر گھری ہو گئی۔

”یہی تھا۔“ اس سے قبل کہ وہ کوئی سوال کرتا

اس نے گویا تقدیمات کی تھی۔

تیمور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کی بے یقینی کیفیت ختم ہو گئی تھی اور اس پسے آگے

نگاہوں کی زبان ارج کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”میں نے انہیں ڈھونڈ لیا ہے تیمور!“ اس نے

سر انداز کر شاخوں سے پرے اڑتے پرندے کو دیکھا۔

پھر دوبارہ تیمور کو۔

”وہ بالکل ویسے ہیں تیمور! جیسا میں نے سوچا

تھا۔ محبت کرنے والے، مجھتوں کا اظہار کرنے والے،

ان کے پاس ایک دوسرے کے لیے وقت ہوتا ہے۔ بنا

کے ایک دوسرے کا وکھ جان لینے والے۔“

”تو تم اس لیے خوش تھیں۔“ تیمور نے تنے پر باتھ

نکا کرس کے چہرے پر چھلتے بے پایا خوشی کے احساس کو جانچا۔

”کیا یہ خوشی کی بات نہیں۔؟“ اس نے جواباً پوچھا۔

”یقیناً!“ تیمور کا الجھ نارمل ساتھا۔

”تمہیں حیرت نہیں ہوئی تیمور! کہ میں اک

معمولی اسکول ماشرکی بیٹی ہوں۔“

”آئی ایم شاکنڈ۔“ اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

”اس شاک کے بعد تم مجھ سے ملا گوا رانہیں کو گئے ہے نا۔“ ارج نے کس سفاکی اور یقین کے ساتھ

سوال کیا تھا۔ حقیقتاً وہ شاکنڈ پہلے نہیں اب ہوا تھا۔

”ارنج...“ اس کے لمحے اور آنکھوں میں بے یقینی

کی بے یقینی تھی۔

”کیونکہ تم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہاں ملنے سے پہلے اسٹینس دیکھا جاتا ہے۔ آج اگر میں رباب، فواد یا جمشید کو یہ سب بتائی تو وہ بھی کی کرتے ہیں۔“

تیمور کامل چلا، سامنے کھڑی لوکی کا خوبصورت چڑھوں سے سخ کر دے۔ اسے ان سارے لمحوں کے رائیگاں جانے کا افسوس ہوا جو اس نے اس لڑکی کی جھوٹی میں ڈالے گھر لگتا تھا۔ جب اس دیکھ دیتے ہیں تو اس لمحے کو وہیں کہیں بھول جاتی تھی۔

کسی درخت کی کھوٹہ میں کسی ریستوران کی میز پر تیمور کو لگا وہ سارے لمحے سڑک کے کنارے پڑے خالی ڈسٹ بن میں ڈال آئی ہے ورنہ کوئی ایک تھوڑا تو اس کا دامن پکڑتا، اسے یہ بات کہنے سے روکتا۔ ارج نے کیا کہہ رہی تھی، تیمور ووقدم پیچھے ہٹا۔

(تو ہوا یہ ارج عثمان! کہ تم یہ گمان کی یہ ڈگان ہی رہیں۔ شاید میری محبت میں ہی کوئی کی تھی۔ شاید تیمور آندھی تھیں محبت کرنا آیا ہی نہیں۔ لیکن ارج نے زندگی میں کبھی ایسا لمحہ بھی آئے گا جو سبھیں تمہارے الفاظ کی بد صورتی کا احساس دلائے گائجھے اسی لمحے کا انتظار رہے گا)

ارنج نے ایک دم خاموش ہو کر درجاتے شخص کو دیکھا۔

”اور میں نے سوچا تھا کہ یہ شخص سی یہ شخص تیمور آندھی سب سے مختلف ہو گا، حالانکہ میں جانتی ہی یہ اسٹینس کمپلیکسز میں بیٹلا، دولت کے پچاری، بھی میرے بارے میں جانیں گے تو ان کا روز عمل کی ہو گا۔ مگر یونہی اک گمان ساتھا کہ یہ شخص۔ مگر تیمور آندھی! تم بھی وہی نکلے۔ ارج عثمان! تم جانتی ہیں کہ آندھی! کیا کہنا تھا رہی تھیں؟“ تیمور نے

کر لے گا۔

”پتا نہیں ہو کیا گیا ہے اس کو۔ پہلے تو ہربات مجھ سے شیر کرتا تھا۔ اب پوچھو تو کہہ دیتا ہے، آپس کی پر اپنے ہے۔“ عینی قدرے تشویش سے کہہ رہی تھی۔

”مجھے تو لگتا ہے، اسی پھول والی کاچکر ہے۔“ ارتخ نے خال آرائی کی۔

”ایسا کچھ ہے تو بتائے بھی۔ جہاں شادی کا نام لو وہ میں تھماں۔“

”مرتیج اور نومی کہاں ہیں؟“

”نومی تو محلے نکلا ہے۔ آپ بیٹھک میں بیبا کے پاس ہیں۔“ عینی کہہ کر پکن میں جلی گئی، کچھ لمحوں کے بعد خوش بخت آگئیں۔

”مرتیج آئی ہے۔“

”آپ! بیبا نے کیا کہا؟“ عینی ان کے پیچے ہی اندر آئی تھی۔

”رشتہ بہت اچھا ہے۔“

”آپ!“ وہ احتجاجاً چلائی۔

”بیبا نے کیا کہا ہے، یہی کہا ہے کہ عینی سے پوچھ لو۔“

”لو مجھ سے کیا پوچھتا ہے انکار کروں بس۔ آپ! کہیں بیبا یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ یہ لوگ میری ایماء پر۔“ اسے ایک دم خیال آیا تھا۔

”بھی... وہ تو بھی سوچتے ہیں۔ تم اپنا فیصلہ دو۔“

”میں نے تو۔“ اس کا جملہ ارمغان کے آنے پر اوہ سوراہ گیا۔ اس نے ایک نظر سب کو دیکھا پھر خوش بخت سے کہنے لگا۔

”آپ! اتارق بھائی آئے ہیں۔“

”طارق....“ وہ ہرڑا کر گھٹی ہوئیں۔ ”کہاں آیا اور اب.....“

”وہ عینی.....“ ارتخ کا کھڑا سی گئی۔

”بیبا کیا۔“ ”تو میں لیا کروں.....“ وہ جنم جلا کر واپس بیٹھیں۔ عینی اسے تفصیل بتانے لگی تھی۔ اس کا ذہن ارتخ نے قدرے جیرت سے انہیں دیکھا۔

”اور اب وہ کیا لینے آئے ہیں؟“ عینی کو غصہ مسکرا تا چھوڑ دیکھ کر کون جان سکتا تھا کہ وہ اس کرا گیا۔

”بیلا آپ کو بلا رہے ہیں۔“ ارمغان نے کہا۔

بات کر لیں ان سے۔“

”میں میں کیا کروں گی ان سے باتیں کر کے انہوں نے بے بی سے بھائی کو دیکھا۔ ارمغان آگے بڑھ کر اپنا مضبوط بازو خوش بخت کے ساتھ مل کر نجات پھیلایا۔

”آپی! بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن ڈرنے یا گھر نے کی ضرورت نہیں، آپ کا بھائی آپ کے ساتھ ہے۔“

خوش بخت کچھ لمحے سوچتی رہیں پھر ایسا ہے۔

ہلا کر ارمغان کے ساتھ یا ہر نکل گئیں۔

”کولد رنک اور ساتھ میں کچھ بھجوادو۔“ ارمغان نے دروازے سے پلٹ کر عینی سے کہا تھا۔

”زہر نہ بھجوادو۔“ وہ چکریوں تھی۔

”عینی۔“ ارتخ نے جیرت سے اسے دیکھا۔ ”کہا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ اضطراری انداز میں ہونٹ کائیں گے۔

”آپی کا طارق بھائی کے ساتھ کوئی جھکڑا ہوا ہے۔“ ارتخ نے پوچھا تو وہ ایک دم جھٹپتی۔

”کوئی جھکڑا۔“

”آپی۔ آپی۔ آپ نے دیکھا، میرے ایو آئیں۔“ تو می خوشی سے جگدا تا چھوڑ لیے اندر آیا تھا۔

”رفع ہو،“ یہاں سے ابو کا چیتتا۔“

”عینی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ ارتخ چکر اگی تھی۔

”وہ سری شادی کر چکے ہیں موصوف، گزشتہ ایک سال سے نومی اور آپی یہاں ہیں اور انہیں خیال نہیں آیا اور اب.....“

”وہ عینی.....“ ارتخ کا کھڑا سی گئی۔

”بیبا کیا۔“ ”تو میں لیا کروں.....“ وہ جنم جلا کر واپس بیٹھیں۔ عینی اسے تفصیل بتانے لگی تھی۔ اس کا ذہن ارتخ نے قدرے جیرت سے انہیں دیکھا۔

سارا گھر خاموش ہو گیا تھا۔ ہر کوئی اپنی ہی سوچ میں گم، ارتخ کو اپنا وجہ اپنے سب کے درمیان اضافی سا لگا، ارمغان اور خوش بخت بیبا کے ساتھ مل کر نجات کرنے کی تھیوں کو سبھا تے رہتے تھے۔ طارق اس دن کے بعد کئی بار آئے تھے۔ وہ خوش بخت کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اپنی غلطی کا احساس بخوبی ہو گیا تھا انہیں۔ بعض مجبوریوں کی بتا پر وہ دوسرا نیوی کو طلاق نہیں دے سکتے تھے۔ مگر خوش بخت کو علیحدہ گھر لے کر دینے کو تیار تھے۔ بیبا نے فیصلہ خوش بخت پر چھوڑا تھا اور وہ کوئی فیصلہ بھی نہ کیا تھی تھیں۔

دوسرے طرف عدیل کے گھروالے پار بار چکر لگا رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے عینی کو یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ اور اب وہ اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

”تم اگر اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو صاف انکار کرو۔“

ارتخ جنم جلا گئی۔

”کیا ہے، تمہارا کیا خیال ہے،“ میں خاموش بیٹھی ہوں۔“ وہ اس سے زیادہ جنم جلا گئی تھی۔ آج کل اس کا مژان یونی ہجڑا ہوا تھا۔

نجانے کیوں ارتخ کو لگا،“ اسے مسلکے اس سے بالا ہی پلاٹے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ کسی نے کچھ نہ کہا تھا۔ مگر ارتخ کے آنے پر وہ سب ایک دم خاموش ہو جاتے تھے۔

”میں چاہوں بھی تو ان میں پوری طرح شامل نہیں ہو سکتی۔“

وہ برگشتہ ہو گئی، اور چاہنے کے باوجود اگلے دو دن تک بیان نہ گئی۔

دو دن اس نے یونی گزارے تھے، یا پھر اپنے

کرے میں گھس کر کتابیں دیکھتے یا آتی جاتی تو گاڑی لے کر سڑکیں ناپنے لگتی۔ اس وقت بھی وہ بدہی سے۔ ”شروفا میں دھوپ۔“ کی ورق گردانی کر رہی تھی جب طازمہ نے آگر پیغام دیا۔

”آپ کو بیکم صاحبہ بلا رہی ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

”پنے کرے میں۔“

اس نے کتاب بند کر کے ریک میں رکھی اور اٹھ کر می کے کرے میں آئی۔

”حسب معمول کسی فائل کے مطالعے میں منہمک تھیں۔ جب سے عامر فارینہ کے ساتھ اس کی فرماں پر سورز رینڈ گیا تھا سارا بوجہ می پر تھا۔ می نے اسے دیکھ کر فائل بند کر دی۔

”اوپنھو۔“ می کے سنجیدگی سے کہنے پر وہ ان کے بیٹھ پر بیٹھ گئی۔

”تم دو دن سے بیال گئی نہیں۔“

”جی۔“ اسے می کی باخبری پر حیرت ہوئی۔

”کیوں۔“ انہوں نے اگلا سوال کیا۔

”تو نہیں۔“

”چاہی بات ہے،“ میں چاہتی بھی نہیں کہ تم بیال جاؤ۔“ می نے پہلی بار اتنے واضح انداز ان پنی تا پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

”میں بیال نہیں گئی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں جاؤں گی بھی نہیں۔“ وہ قدرے بد نیزی سے گویا ہوئی۔ می نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کیا۔

”میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ یہور نے تمہارے لیے باقاعدہ پر پونل بھجوایا ہے۔“

”واٹی۔“ وہ اچھل ہی تو پڑی۔“ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”اس کی می کا کل امریکہ سے فون آیا تھا، اگلے ہفتے وہ لوگ واپس پاکستان شفث ہو رہے ہیں۔ اور وہ یہور کا گھر مکمل ہو گیا ہے اور وہ بیال شفث بھی کر گیا ہے۔“

”آئی کانٹ بلیووس سے“

”وہ زیر لب بڑی طالی۔ پھر می

سے پوچھنے لگی۔

”اپلیاں انہوں نے تیور سے پوچھا ہے؟“

”وکیا وہ تیور کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ کر سکتی

ہے۔“ انہوں نے اثاثاً سوال کیا۔ وہ بس الجھ کر انہیں

دیکھنے لگی۔

”میں نے انہیں ہاں کر دی ہے۔؟“ میں نے

اطمینان سے بتایا تو وہ متھری انہیں دیکھنے لگی۔

”تمہاری پر ابلم یہ ہے کہ ارنج بکہ تم نے افتاب کرنا

نہیں سکھا۔ ورنہ تیور ایسا لڑکا نہیں کہ جس کے لیے

اتنسوچناڑے۔“

”وہ کیسا ہے، میں جانتی ہوں۔ لیکن آپ میری زندگی کے بارے میں اس طرح فیصلہ نہیں کر سکتیں۔“

ابھی پچھوڑنے پلے اسی تیور کے لیے وہ خوش بخت کی گودیں سر رکھ رہی ہی۔

”تمہاری شادی تیور سے ہی ہو گی۔“

”میری شادی کس سے ہو کی، یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے۔“ وہ تیز لمحے میں گویا ہوئی، میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔

”ٹھیک ہے، میں تین دن کے لیے اسلام آباد جا رہی ہوں۔ والپس آؤں تو فیصلہ بتائیں۔ لیکن آیک بات یاد رکھنا، فیصلہ تیور کے حق میں ہونا چاہیے۔“

ان کا الجھے پلے پچھے لمحے لب کاٹتی رہی پھر سر اٹھا کر کنے لگی۔

”بلایا۔“ میں نے تدو تیز لمحے میں اس کی بات کاٹی ”وہ کون ہوتا ہے تھیں مشورہ دینے والا۔“ انہیں پچھوڑ مسکس کرنا ہے تو مجھ سے کرو۔“

”میں ابھی ازماں فادریس۔“ وہ احتجاجاً ”چلائی۔“

”ہرگز نہیں نہ وہ تمہارا اپنے اور نہ وہ لڑکیاں تھیں۔“ کوئی رشتہ نہیں تھیں اس گھر کی

ساتھ۔ وہ دیوانہ وار اس کے تعاقب میں دوڑ رہی تھی ابھی لمبی گھاس، تو کیلی شاخیں، گھنی تاریکی، کانٹوں کا سفر جب اسے لگا کہ بس اس کا سائنس اکھڑ جائے گا وہ

چھپی۔“

”جھوٹ میں نہیں، جھوٹ ان لوگوں نے بولے

تمہارے ساتھ، تمہارا اصلی یاپ مرچ کا ہے۔“ اس

نے گویا عم پھوڑا تھا۔

وہ ششدہ رہی رہ گئی۔

”نہیں۔ میں یہ جھوٹ ہے۔“

”یہ چیز ہے۔ صلاح الدین مرچ کا ہے۔“ میں کا

پت ہوا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ وہ پلے اسی گھر میں رہتا۔ لیکن اب وہ گھر اس کے دوست ماسٹر شجاعت پا سے ہے جس کو تم اپنا یاپ سمجھتی رہی ہو وہ تمہارا

باپ کا دوست ہے انہوں نے تم سے جھوٹ بولنا تو میں یہ تھی وہاں انی سے ملی بھی تھی۔ اچھے لوگ

ہیں۔ تم بہت خوش ہیں، میں خاموش ہو گئی مگر ک

تک ایک نہ ایک دن تھیں اس حقیقت کا سامنا

ہی تھا اس لیے۔“

وہ لڑکھراتے قدموں سے باہر نکل گئی۔ گویا ہذا

آسمان گھوم رہے تھے۔

”وہ جنہیں اس نے اپنا سمجھا اس کے نہیں تھے۔ اپنے بیڈ پر کر کر وہ چیخ پیچ کر رہی تھی۔“

”کیا اس کی قسمت میں بھی لکھا تھا کہ وہ جس کو

سمجھو ہی اس کا نہ رہے۔“

● ● ●

بہت گھننا جنگل، مہیب تاریکی، کھل کر رہتا آہے

اور کڑکتی بجلیا۔

وہ رستے کی تلاش میں لمبی گھاس میں اوہ رادھر رہی تھی۔ مگر وہ لمبی گھاسیں بار بار اس کے قدموں پر لپٹ کر رستہ روک لیتی تھی۔

”کوئی ہے۔ کوئی ہے۔“ وہ بندیوں پر چیخ رہی تھی ہاتھ پھیلا پھیلا کر کوئی سارا تلاشتی تھی۔ بدلہ بہت زور سے گرجے اور وہ بے دم ہو کر گھنٹوں کے لئے گر گئی اور اونچا اونچا نچاروں نے لگی۔

تب ہی بہت دور سے اسے والن کی آواز سندا

دی۔ وہ دیوانہ وار اس کے تعاقب میں دوڑ رہی تھی ابھی لمبی گھاس، تو کیلی شاخیں، گھنی تاریکی،

”آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔“ وہ بلند تو اڑ میں

جب اسے لگا کہ بس اس کا سائنس اکھڑ جائے گا وہ

فرانسیسی طرز کے درپیچوں والا گھر اس کے سامنے آگیا۔

تیزیارش کے ساتھ وہ سفید پھول اس پر بیٹنے لگے

ماربل کی یہڑی ہیاں اس کے سامنے تھیں۔ اسے

لگا، وہ یہ یہڑی ہیاں بھی عبور نہ کر پائے گی۔ مگر اپر سے

اٹھتی ماوسی دھن نے اسے اپنی طرف چھیخ لیا۔ مگر

تسری یہڑی پر ہی وہ ساری یہڑی ہیاں یکخت غائب

ہو گئیں۔ اس سے قبل کہ وہ پشت کے مل نیچے گرتی،

کسی نے اسے سنبھال لیا تھا۔

”سنبھل کر۔“ وہ سرگوشی۔

وہ سرے پل اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا اور وجود

پسند ہے ہور باتا تھا، اسے لگا وہ واقعی کسی جنگل سے

بھاگتی آتی ہے اور لمبی گھاس اس کے قدموں سے اب

بھی لپٹی ہے۔ اس نے لمبہ اک پاؤں چھیخ لیے۔

”ارنج بیلی! اکھانا کھائیں۔“ ملازمہ اسے پکار رہی

تھی۔ اسے اپنی آنکھ کھل جانے کا سبب معلوم ہوا تو

ملازمہ پر ہی الٹ پڑی۔

”کیا تکلیف ہے؟“

”وہ بیلی! ایس تو۔“

”ایٹ لاست...“ ملازمہ نے غائب ہونے میں

زیادہ دیر نہیں کی۔

ارنج سائیڈ نیبل سے گاس اٹھا کر غٹاغٹ پانی

چڑھا گئی۔ پھر اٹھ کر گلاس ڈور کھولا۔ میں کو اسلام آباد

چھے آج دوسرا دن تھا اور تب سے اب تک وہ اسی

کر رہے میں بند ہی۔ اور اس دیڑھ دو دن میں وہ اتنا

سیوچ چکی ہی کہ مزید کچھ بھی سوچنے کی قابل نہ رہی

تھی۔ لیکن ایک چیز کی وہ قائل ہو گئی تھی۔

ان کی محبت اور فریاد دی کی۔

ورنہ کون اک اجسی لڑکی کویوں اپنے درمیان جگہ

وے کر گھنٹوں سے نوازتا ہے اسے خوش بخت میں

مال کی ممتاز محسوس ہوئی تھی۔

عینی کی دوستی یا یاکی شفقت عنور کی شوخیاں

”میں نے کہا تھا متوسط طبقے کے لوگ محبت کرنا

جانتے ہیں۔“

عجب رت ممکنی ہے اب کے برس

بے کھا تھا۔

”تمہارا اس لڑکی سے کوئی رشتہ نہیں۔ مگر تمہارے اس کی سمت اٹھنے والی نگاہ وہی ہوئی چاہیے جو یعنی اور نور کی طرف اٹھتی ہے۔“

ضبط کی کن کڑی منزوں سے گزر اتھا وہ۔
پل پل جینے اور مرنے کی کرب آمیز کیفیت مال جیسی بہن سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ خوش بخت نے اس سے پوچھا۔

”ارمغان! وہ لڑکی جس کے لیے تم پھول خریدا کرتے تھے ارتیج ہے تا۔“

اس کا دل چاہا، وہ ان کی گود میں سر رکھ کر اپنا سارا دک کہہ دے۔ مگر مرد تھا نا۔ خاموشی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

پھر دکھ اور کرب کی اس کیفیت پر غصہ غالب آئے لگا۔

وہ اس کے سامنے آتی تو اس کا دل چاہتا اے جنجنحوڑ جنجنحوڑ کر دل کی ہر کیفیت اس پر آشکار کروے۔ مگر خوش بخت نے کہا۔

”وہ پہلے ہی رشتول سے بد گمان ہے ارمغان! اور جو رشتہ وہ تم سے باندھ بیٹھی ہے، اس کے بعد اگر تم نے اس سے پچھ کھاتو وہ بالکل ہی بے اعتبار ہو جائے گی۔“

وہ شاید خوش بخت کی بات کبھی نہ مانتا۔ اگر ارتیج کے لبؤں پر تیمور کا نام نہ سن لیتا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ توپائی پر گھونانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نادان چاند چھونے کی تمنا کر رہا تھا۔

”ارمغان!“ نجانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا۔ ارتیج نے پکارا تو چونک گیا پھر طویل سانس لے کر پوچھنے لگا۔

”تیمور کیسا ہے؟“

”تیمور...“ ارتیج کی آنکھوں میں تحریک آیا۔ ”تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ وہ مبہم سامسکرایا۔

”میں نے اس کا نام تمہارے لبؤں سے سناتھا۔ اور مجھے لگتا ہے ارتیج! تم اس سے اور وہ تم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ محبتوں میں بد گمانی نہیں ہوئی چاہیے۔“

چاند روشن ستارے مدھم ہیں
وہ آہستگی سے چلتی ہوئی پر آمدے میں آگئی۔ اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
اک دیا سا جلا اتھا بستے پانیوں میں۔
تب سے اب تک مخوردھم ہیں
ارمغان!“ اس نے آہستگی سے پکارا۔
اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔
تم۔“

”ہم نے تو تیرے و صل کے سب خوابیں لیے۔
ارمغان نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر دی وی آف کر دیا۔

”بہت دنوں کے بعد آئیں ارتیج۔“ اس کا الجہ مددھم، مگر ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔

”چار دن ہی تو ہوئے ہیں۔“

”ہاں۔“ وہ قصدا“ مسکرا یا۔
”سب لوگ کہاں ہیں؟“

”یا یا مسجد میں گئے ہیں، یعنی اور نور پکن میں ہوں گی۔“

”ارمغان! تم لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

اس نے گویا ارمغان کی بات ہی نہ سئی، بس سوال کیا تھا۔

ارمغان نے سرا اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

”یا یا کہتے تھے اگر میں اس دن انکار کر دیتا کہ وہ ماشر صلاح الدین نہیں تو یہ لڑکی خود کشی کر لیتی۔“

”ہاں یہ ان کا مجھہ راحسان ہے۔“

”احسان سے وہ تمہیں اب بھی اپنی بیٹی سمجھتے ہیں۔“

”اور تم۔؟“ ارتیج نے پرہ راست اس دی کی آنکھوں میں جھانکا، وہ پچھ لمحے شہش کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کی پوسٹ کی ہوئی شام آج ارتیج کو ملی ہے اسے افسوس سا ہوا۔

کاش آج بھی ایسا نہ ہوتا۔

اس نے اس لڑکی کو واپسی چلا ہاتھا۔ مگر بیانے اس

اک بلکی سی چھین
اک ترپ اک پکار

”کون ہے؟“ اس کا دل بار بار پکار رہا تھا۔
تب ہی وائلن کے سر خاموش ہو گئے۔
وہ پکھ لمحے منتظر ہی۔ پھر بے چین ہو گئی۔
ماربل کی سفید سیر ہیاں اس کے سامنے تھیں۔
ایک پل کو گرنے کا خوف و امن گیر ہوا۔
دوسرے پل اسے لگا، اگر وہ یہ سیر ہیاں عبور کر گئی
تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بے چینی حد سے بڑھی تو وہ
دیوانہ وار ان کی طرف بھاگی۔

”ارتچ۔“ کسی نے اچانک اسے پکارا۔ اس نے
تیزی سے پلتا چلا کہ پاؤں رپٹ گیا۔ اس کے منہ سے
چین نکل گئی۔ مگر وہ مضبوط بازوؤں نے اسے سہولت
سے سنبھال لیا۔ وہ ترپ کر پٹھی پھر ساکت رہ گئی۔
”سبھل کر چوٹ تو نہیں آتی۔“ وہ نرمی سے پوچھ
رہا تھا۔

”تم نے گرنے ہی کہا ہے۔“ وہ بے اختیار ہوئی۔
”مجھے معلوم تھا، تم آؤ گی۔“ اس کے لمحے میں اپنی
محبت کا یقین بولتا تھا۔
”تیمور میں!“

”ہش۔“ تیمور نے کچھ کرنے ہی نہ دیا۔ پھر سارا
دے کر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

”آؤ اور چلیں۔“

”تیمور آج وہ من۔“

”تمہارے لیے کمپوز کی ہے۔“
بارش ہوا کی تال پر دیوانہ وار رقص کر رہی تھی۔
سینزیل سفید پھول بر سارہی تھی۔
تیمور کا ہاتھ تھام کر سیر ہیاں چڑھتے ہوئے وہ
مکراوی۔ وہ تیمور کو یہ نہ بتا سکی کہ اس نے یہ دھن
آن تحقیق نہیں کی۔

س لدر سفای سے ہمہ رہیں۔ ارتھ بُل بھی نہ سکی۔ اسے لگا سامنے کھڑی اور آج اس کی سمجھ میں تیمور کی بات آئی تھی۔

یعنی نہیں رباب۔ ہے۔ وہ خاموش کھڑی اپنے سس نے کہا تھا۔

کسی کے جلتے خواب دیکھتی رہی۔

”مجبت کسی طبقے کی میراث نہیں ارتھ عثمان! مجبت طارق بھائی نے بھی آپی سے مجبت کی تھی اور کرنے کے لیے ایک خالص، سچا اور کھرا دل چاہیے نے انہیں دیوتا سمجھ کر پوچھا تھا، کیا صد ملاں کی موتا ہے جو کسی کے پاس بھی ہو سکتا ہے۔“

کا۔“

”آپی کہاں ہیں؟“ اس نے پست آواز میں پوچھ کر نے اور اس کے اظہار کے اپنے طریقے اگر کوئی اپنی ”چل گئیں۔“

”کہاں؟“

”اپنے شوہر کے گھر، طارق بھائی نے انہیں اسے ممی یاد آگئیں۔ اپنی سکی اولاد سے اس کی گھر لے دیا ہے۔ مجبوری تھی، اپنے بیٹے کی خاطر خاطر جھکڑی ہوئی۔

تھا ہی۔“ وہ سپاٹ سے لمحے میں کہہ رہی تھی۔“ اس نے گاڑی اشارت کی اسے لگا ہو گئے جنگل میں ٹوٹ جائیں تو گیا مجبت کیا نفرت، بس سمجھوتا ہے۔“

پس لے رہے رستہ بنا رہی ہے۔“ مجبت ہمیشہ اس مان کے ساتھ روٹھتی ہے کہ اسے اور انہوں نے بھی اولاد کی خاطر سمجھوتا ہے۔“

ہے اس گھر سے نکلی تو قدم لڑکھدار ہے تھے۔

لمحے اس کی سوچ کوئی مست لے گئے۔

”آؤ۔“ میں تمہیں چھوڑ آؤ۔“ یادیں پڑے تھے ارمغان اس کے قریب آکر کہہ رہا تھا۔

”وہ نہیں۔“ میں گاڑی میں آئی تھی۔“

وہ اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا اور اس بھتھا۔

پارش میں وہ نجانے کہاں کہاں بیٹھکی تھی۔ اور کہاں بیشکل نگاہ اخھائی تو ساکت رہ گئی جماں تھی وہیں کراس کے پاؤں ہر یک پر شرے تھے۔

ہاں وہ تابندہ اور ظہیر تھے۔

اور ان کی گود میں دوسال کا بچہ۔

ابھی چند ہفتے قبل وہ ان سے ملی تھی تو تابندہ پھول اس پر بر سانے گئی۔

”ویکھیں، ہم دونوں میں سے کس کی مجبت ہے۔“

خوش و خرم، ہنستے مسکراتے وہ دونوں، اک فیملی۔

اس دھن میں اک عجیب سا اسرار تھا۔

اک نامعلوم سا وکھ۔

محبت کی ہے تو اقتبار بھی کرنا سیکھو۔ اگر وہ خفایہ ہے تو متنا
لو کہ محبت ہمیشہ اسی ماں کے ساتھ روشنی ہے کہ
اسے منالیا جائے گا۔“
”ارمنغان تم...“ وہ اس سے آگے کچھ بھی نہ کہ
پائی۔ ارمغان نے خاموش ہو کر لی وی آن کرویا۔
”بیانے کما تھا۔“
وہ ہمارے پاس امانت ہے۔ میں نے اس کی ماں
سے وعدہ کیا ہے کہ اس کی امانت ویسے ہی واپس لوٹا
وول گا۔“
اور وہ امانت دار بیاپ کا دیانت دار بیٹا تھا۔
ارتیج کھڑی ہو گئی۔
عینی پچن میں بھی، کسی کارڈ کے نکڑے نکڑے
کر کے جلا تی ہوئی۔ ارتیج نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ
سے یا قی کارڈ چھین لیے۔
”یہ کیا کر رہی ہو عینی...؟“ عینی خاموش کھڑی
راہی۔

”اُز کے سارے کارڈ کیوں جلا رہی ہو۔“
”کیونکہ میں نے ... وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی
پھر سنبھل کر بولی۔
”میں نے دنیا سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“
”واٹ؟ آریو میڈی...“ ارتھ چیخ اٹھی۔ ”تم تو اس
سے محبت کرتی چھیں گئی۔“
”خالی پیٹھ تو محبت بھی اچھی نہیں لگتی ارتھ۔“
”تھان سننس... یہ سب تمہیں پسلے بھی معلوم تھا
یعنی۔“ وہ بگڑ کر بولی۔
”مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے لیے دنیا کا
رپوزل آجائے گا۔“ یعنی نے اطمینان سے کہا اور اس
کے ماتھے سے کارڈ لے لے

”عینی تم۔“ وہ ششد ری کھڑی رہ گئی۔
”مرتیج! میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے،
میں اپنی کوئی زندگی انتظار میں نہیں گزار سکتی۔ اس
کے بعد بھی کیا گا کہ نہیں ہے کہ وہ مجھے ایک اچھی زندگی
دے سکتا ہے گا۔ وایصال کی پاس پہلے سے سب کچھ مدد حاصل
ہے۔ مجھے معمولی معمولی چیزوں کے لیے ترسنا تو نہیں